Scanned by CamScanner

سات نوبل انعام یافتہ ادیب

ڈاکٹر اعجاز راہی

نگران اعلیٰ	:	افتخار عارف
تزئین و طباعت		طارق شاہد
سال اشاعت		۱۹۹۴ء
تعداد		پانچ سو
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان ایچ ۸/۱، اسلام آباد
کتابت		کمال خان
مطبع		کرسٹل پرنٹرز، اسلام آباد
قیمت		مجلد -/۲۰۰ روپے پیپر بیک -/۱۸۵ روپے

ISBN : 969 - 472 - 024 - 9

فہرست

پیش نامہ

ملک کے ممتاز ادیب اور دانشور ڈاکٹر اعجاز راہی کی کتاب "سات نوبل انعام یافتہ ادیب" پیشِ خدمت ہے۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے سابق صدر نشین جناب پریشان خٹک نے ۱۹۸۶ء میں اس سلسلہ مطبوعات کا آغاز کیا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز راہی نے اس کتاب میں بک، سالبیلو، سنگر، فاکنر، ہیمنگوے، سٹین بک اور اونیل جیسے عہد ساز اور عظیم المرتبت قلم کاروں کے احوال و آثار پر تفصیلی مقالے سپردِ قلم کیے ہیں۔ ساری دنیا ادب کے مختلف اصناف میں ان کے قلم کی عظمت و انفرادیت کا اعتراف کرتی ہے۔

اُردو میں ایسی حوالے کی کتابیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ یقین کیا جانا چاہیئے کہ یہ کتاب ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں اور خصوصی طور پر نئے تخلیق کاروں میں مقبول ہوگی۔

اس کتاب کے مرتّب کرنے کے سلسلے میں ادارہ ڈاکٹر اعجاز راہی کا ممنون ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اکادمی کے قائم مقام افسر مطبوعات طارق شاہد بھی بجا طور پر داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی لگن سے اس کتاب کو طباعت کے مراحل سے ہمکنار کیا۔

افتخار عارف

مشرق اور مغرب کا سنگم

پرل ایس بک

مشرق کی باطنی دنیا اور مغرب کے مادّی مظاہر پرل ایس بک کے ہاں جس طرح ایک دوسرے کا جزو لاینفک بن کر اُبھرتے ہیں، اس کی مثال کسی اور تخلیق کار کے ہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ پرل ایس بک دو تاریخوں، دو تہذیبوں، دو ثقافتوں، دو مذہبی اور عقیدی رویوں، دو روایتوں اور دیومالاؤں، دو لوک ورثوں اور دو فکری دھاروں کے درمیان ایک ایسا پل ہے جہاں یہ سب ایک دوسرے میں جذب ہوتے نظر آتے ہیں۔ پرل ایس بک کا فن ایک ایسی پورٹریٹ ہے جہاں مشرقی پراسراریت اور مابعدالطبیعات بحیثیت معروض مغربی مادی زندگی کے رنگوں سے مکمل ہوتی نظر آتی ہے۔

پرل ایس بک کے والدین جن مقاصد کے لئے سرزمین چین پر اترے تھے، اس سے قطع نظر کے پرل ایس بک نے ان مقاصد کی آبیاری کے لئے کیا کردار ادا کیا، ایشیا اور ایشیا کی معاشرتی زندگی کا اسرار اس کے اندر اس طرح اتر گیا تھا کہ "میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دونوں میں سے کون سا ملک میرا اپنا ہے۔ نہایت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ میں

اتنی ہی ایشیا کی وفادار ہوں جتنی کے اپنے ملک کی"۔ اس نے جس انداز سے مشرق کو دیکھا، اپنا بچپن گزارا، اس نے اسے چین کے اس قدر قریب کر دیا کہ" میری وابستگی اتنی ہی مشرق سے جتنی مغرب سے ہے"

پرل سائیڈن سٹرائیکر بک PEARL SYDEN STRICKER BUCK

بلز بورو مغربی ورجینیا امریکہ میں ۲۶ جون ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئی۔ اس کے والد ابسلوم ABSLOM سائیڈن سٹرائیکر اور والدہ کیرولین CAROLINE دونوں امریکی مشنری ادارے سے منسلک اور چین میں تبلیغی سرگرمیوں میں معروف تھے۔ دونوں خاندان ورجینیا اور مغربی ورجینیا میں دیر سے آباد تھے اور امریکی خانہ جنگی کے دور میں بھرپور حصہ لے چکے تھے۔

پرل بک ابھی بہت چھوٹی تھی، کہ اس کے ماں باپ امریکہ سے چین کے انتہائی اندرونی علاقوں میں اسے لے کر چلے گئے۔ جہاں وہ اپنی مشنری فرائض ادا کر رہے تھے، اندرونی چین ہمیشہ انتہائی موسموں کی زد میں رہتا ہے جس کے سبب ابسلوم کے سات بچوں میں سے صرف تین زندہ رہ سکے تھے جن میں ایک پرل، ایک اس کا دس سالہ بڑا بھائی اور ایک سات سالہ چھوٹی بہن گریس تھی۔ اس کا باپ زیادہ تر یانگشی کے علاقے میں رہا مگر اسے ملک کے دیگر اندرونی علاقوں میں بھی جانا اور رہائش پذیر ہونا پڑتا۔ وہ جہاں بھی رہے، پرل مشنری کے احاطے کے اندر جہاں مقامی لوگوں کا عام طور پر گزر کم کم ہوتا تھا، اپنے بچپن کے انتہائی دن عبور کرتی رہی۔ لیکن ذرا بڑی ہوئی تو اس نے چینی بچوں کے ساتھ کھیلنا، دوڑنا اور دن بھر چینی معاشرت کی بو باس لاشعوری طور پر اپنے اندر اُتارنا شروع کر دیا۔ چینی بچوں کے ساتھ کھیلنے کا پہلا نتیجہ زبان کی صورت ظاہر ہوا، اس نے انگریزی بولنے سے قبل چینی بولنا سیکھ لیا۔ یہ بات ماں کے لئے قدرے تشویش کا باعث بنی، چنانچہ ماں نے اسے انگریزی

بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھانا شروع کیا۔ انگریزی گرامر، جملہ سازی اور حرف و نحو سکھانے کا سلسلہ بہت کم عمری میں آغاز پاگیا، جس کے سبب اس نے پہلے چینی بولنا سیکھا تھا مگر لکھنے اور پڑھنے میں انگریزی سبقت لے گئی۔

پرل اپنی عمر کے چینی بچوں کے علاوہ گھر میں آنے والے تمام چینی لوگوں سے بڑی آزادی کے ساتھ ملتی۔ اس میں کہانی سننے کا شوق بہت چھوٹی عمر میں پیدا ہوگیا تھا جب اسے ماں درجینا کی زندگی اور امریکی خانہ جنگی کے بارے میں کہانیاں سناتی تھی۔ یہ شوق رفتہ رفتہ تجسّس میں بدل گیا اور اسے جلد ہی چینی روایتی کہانیوں، داستانوں اور اساطیر نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ ہر آنے والے سے سوال کرتی، اور چینی معاشرت اور لوک کہانیوں کے بارے میں جاننا چاہتی۔ اس کی چینی آیا اسے نہ ختم ہونے والی چینی داستانیں سناتی جس کا تحیر اور سنسنی خیزی کئی کئی دن جاری رہنے والی کہانی کے ساتھ اس کے لاشعور کا حصّہ بنتی رہتی۔

ان کا فیملی ڈاکٹر ایک ہندوستانی ماہر طبیب تھا۔ پرل اس سے ہندوستانی اساطیری کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوگوں کے بارے میں پورے تجسّس کے ساتھ باتیں کرتی اور اکثر و بیشتر اس کے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے ذریعے ڈاکٹر سے گھنٹوں گفتگو کرتی۔ اسی طرح ان کے قرب و جوار میں انڈونیشی، برمی، سری لنکن، سری نامی، جاپانی اور دیگر ایشیائی علاقوں کے خاندان آباد تھے۔ پرل ان کے بچّوں کے ساتھ کھیلتی اور ان کے گھروں میں بیٹھ کر وہاں کی کہانیاں اور لوگوں کے بارے میں قصے سنتی، جس سے امریکہ کے علاوہ، جو اس کے شعور میں ماں کی وساطت سے منتقل ہو رہا تھا، کئی اور دنیائیں بھی آباد ہونے لگیں۔ ماں اسے مغربی مصنّفوں خصوصاً انگریزی لکھاریوں کی کتابیں لا کر دیتی۔ سات سال کی عمر میں ماں نے اسے شکسپیئر، سر والٹر سکاٹ، ایلیٹ، تھیکرے، اور ڈکنز کی کتابیں لا کر دیں۔ اسے ڈکنز بہت پسند تھا۔ جس کے اثرات اس

کے ابتدائی فن پر بھی نظر آتے ہیں

اس کی چینی زبان کے لئے ایک استاد مقرر ہوا جس کا نام کنگ KUNG تھا۔ وہ نظریاتی طور پر کنفیوشس کا پیرو کار اور قوم پرست رجحانات رکھتا تھا۔ پرل کی ابتدائی زندگی میں ذہنی نشوونما پر کنگ کے اثرات بڑے گہرے ہیں اور جس کا واضح ترین ثبوت غیر ملکی ایکپلائٹیشن ادراک کے حوالے سے اس کے ادب میں نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی اواخر اور بیسویں صدی اوائل کا چین ایک ایسے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ جہاں سونے اور جاگنے کے درمیان غنودگی سے آگے بڑھ کر وقت کروٹ لیتا محسوس ہوتا ہے۔ انیسویں صدی نصف کے قریب برطانوی تسلّط کے بعد ۱۸۵۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی مشترکہ فوج کشی نے چینیوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ حملہ آوروں کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ جس کے نتیجے میں غیر ملکیوں نے جہاں بندرگاہوں کو استعمال کرنے اور تجارتی اجازت نامے حاصل کئے، وہیں ان کی ثقافتی اور بالا دستی کی یلغار بھی جاری رہی۔ اس دوران چین میں آخری بادشاہ HSUANTUNG کی حکمرانی تھی مگر ملک میں پیدا ہونے والی شورشوں نے اس کے پایۂ تخت کو ہلا دیا تھا۔ انقلابی تحریکیں سن یات سین کی قیادت میں مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں۔ ۱۹۰۰ء میں ایک معاہدے کے ذریعے، جس کے تحت فرانس اور برطانیہ کے علاوہ دیگر ممالک بھی چین سے تجارتی رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ امریکہ بھی چین میں داخل ہوا۔ اس وقت منچوریا سے یانگسی تک تمام بندرگاہیں غیر ملکی جہازوں کے لئے کھولی جا چکی تھی۔ ۱۹۰۰ء سے قدر قبل غیر ملکیوں کے خلاف نوجوان نسل میں جذبۂ نفرت نے سر ابھارا اور "باکسر باغیوں" کی ایک تنظیم نے غیر ملکیوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ کئی غیر ملکی ان نوجوانوں کا نشانہ بنے۔ چنانچہ غیر ملکی باشندے اندرونِ چین سے بھاگنے لگے، ان کا رُخ عموماً بڑے شہر تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں ہی پرل کے والدین بھی یانگسی سے بھاگے اور شنگھائی میں

اُکر آباد ہوئے۔

پرل کا استاد جہاں اسے چینی نصاب پڑھاتا، وہیں اسے کنفیوشسزم کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کرتا۔ کنگ ایک قوم پرست پڑھا لکھا انسان تھا۔ وہ اکثر پرل سے کہتا کہ وہ دن اب قریب ہے، جب تمہیں تمہارے والدین اور تمام غیرملکیوں کو چین سے نکلنا پڑے گا۔ پرل اس سے سوال کرتی، وہ جواب دیتا اور گھنٹوں سوال و جواب کا سلسلہ دراز رہتا۔ چینی اپنے ثقافتی ورثے اور تاریخی قدامت پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ اور زندگی پر بات کرتے ہوئے کبھی تھکتے نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں کنگ کی وفات کے بعد اسے شنگھائی سے قدرے فاصلے پر قائم مس جیول کے ایک بورڈنگ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اب پرل کے سامنے زندگی کے تجربات اور واقعات ایک نئے انداز میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ مس جیول جو سکول کے علاوہ سماجی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں پرل اس کا ساتھ دینے لگی، جس سے چینی معاشرت کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور اسے سمجھنے کا موقع ملا۔

مس جیول کے سکول میں اکثر ایسی غلام لڑکیاں لائی جاتیں، جن کے آقا ان پر طرح طرح کے مظالم توڑتے۔ جسمانی بے آبروئی سے کر روحانی بے توقیری تک ان کا مقدر تھا۔ ان لڑکیوں کے ساتھ پرل گھنٹوں گفتگو کرتی اور ان کے حالات جانتی۔ چونکہ پرل چینی جانتی تھی، اس لئے چین کے روایتی اور ظالمانہ معاشرے کو اس کی پراگندہ ذہنیت کے ساتھ سمجھنے میں اسے بڑی مدد ملی۔

مس جیول دارالامان کی طرز پر بے سہارا خواتین کے لئے ایک خیراتی ادارہ بھی چلاتی تھیں، جن میں عورتوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے سلائی پروئی، کڑھائی اور دوسرے دستی کاموں کی تربیت دی جاتی۔ یہ ادارہ بھی رنگا رنگ عورتوں سے پُر تھا۔ یہاں بے سہارا چینی عورتوں کے علاوہ سفید فام خواتین بھی تھیں، جن میں سے بیشتر عورتیں طوائفوں کے

پیشے کو ترک کر کے یہاں آ ئی تھیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں، کہ اس دور میں شنگھائی میں دنیا کے سب سے بڑے قحبہ خانے آباد تھے۔ درون چین سے غربت، افلاس اور قحط کی ماری خواتین کے علاوہ دنیا بھر سے مجبور عورتوں کو یہاں جمع کیا گیا تھا۔ چنانچہ چینی معاشرے کے بندرگاہی شہروں میں ایسی عورتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جو قحبہ خانوں کی زینت بنتی تھیں۔ مس جیول کے خیراتی دارالامان میں پرل کی ایسی بیشتر خواتین سے ملاقات ہوتی جو چینی روایتی، افلاس کے ہاتھوں یہاں تک پہنچی تھیں۔ ایسی خواتین بھی اس کے مشاہدے میں لائی گئیں جو دوسرے ممالک سے اغوار یا کسی دوسرے اسباب سے یہاں آ گئیں تھیں۔ ان تجربات نے پرل کے ذہن پر گہرے نقوش ثبت کئے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک مس جیول کے بورڈنگ سکول میں نہ پڑھ سکی اور جب گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئی اور ماں سے وہاں کے قصے بیان کئے، تو ماں نے اسے دوبارہ بورڈنگ سکول جانے سے روک دیا۔

۱۹۱۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے اسے ورجینیا بھیج دیا گیا، جہاں اس نے روڈالف میکن ROUDALPH MACON کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کا ماحول اس کے لئے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ وہ ایک محدود ذہن کے سماج سے یک دم ایک آزاد سوسائٹی میں آئی تھی۔ خود کو ماحول کے لئے اجنبی محسوس کرتی، لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور امریکی معاشرت میں جگہ پانے لگی۔ لوگوں میں گھل مل گئی۔ اس کی نصابی سرگرمیوں کے ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں۔ اسے کلاس روم میں صدر چن لیا گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے کالج کے میگزین میں کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔

۱۹۱۴ء میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد کالج ہی میں معاون استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی، مگر ماں کی شدید بیماری کی اطلاع پا کر سال کے اواخر میں شنگھائی واپس آ گئی اور ماں کی صحت یابی کے بعد ایک تعلیمی ادارے میں انگریزی کی تعلیم دینے

پر معمور ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں ایک زرعی ماہر ڈاکٹر جان لوزنگ بک JOHN LOSSING BUCK سے شادی کر لی۔ جان جدید امریکی طرز زراعت کو چین میں روشناس کرانے کے لئے شمالی چین میں کام کر رہا تھا، وہ بھی وہیں آگئی۔

شمالی چین میں اس نے غریب کسانوں کے زندہ رہنے کی جدوجہد کو بہت قریب سے دیکھا۔ جاگیرداروں کے مظالم، قحط، بدحالی ان علاقوں کا مقدر تھی، وہ دیگر سفید فام لوگوں کے برعکس عام خواتین سے آزادانہ ملتی، ان سے گفتگو کرتی اور ان کے دکھوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتی۔ ۵ سال بعد وہ اور اس کے میاں دونوں نانکنگ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔ ڈاکٹر جان لوزنگ زرعی تعلیم اور پرل ادب کی ٹیچر تھی۔

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں اس کی ماں کیرولین کا انتقال ہو گیا۔ یہاں سے اس کی ادبی زندگی میں ایک نیا کام داخل ہوا، اور اس نے اپنی مشنری ماں کی سوانح مختصر لکھنا شروع کر دی۔

نانکنگ کی معاشرتی زندگی عجیب تضاد کا شکار تھی، نئے خیالات اور نئے رجحانات نے چین کی روایتی زندگی میں دراڑیں ڈالنی شروع کر دی تھیں۔ نوجوان نسل میں جوش، جذبہ اور بغاوت کے میلانات جنم لے رہے تھے۔ نئے رویوں کی قبولیت اور نا قبولیت کے درمیان ایک نیا تصادم ابھرنے لگا۔ جو نوجوان مغرب کی آزادانہ زندگی اور سائنسی انکشافات سے آگاہی حاصل کر چکے تھے، ان کے لئے چین کی روایتی زندگی سے سمجھوتہ مشکل ہو رہا تھا۔ پرل نے نانکنگ کے اس نئے رویّے کو اپنی تحریروں کا موضوع بنانا شروع کیا اور جنوری ۱۹۲۳ء میں ماہنامہ اٹلانٹک MONTHLY ATLANTIC میں "ان چائنا ٹو" INCHINATOO کے نام سے اس کا مضمون شائع ہوا، جس میں اس نے چین میں بدلتے ہوئے رجحانات کی نشان دہی کی۔

اب اس کا اگلا قدم افسانے کی دنیا تھی۔ افسانوں کے ساتھ پہلے ناول پر بھی کام شروع

کیا۔ مطالعے کی وسعت کے لیے پروست، زولو، ہمینگوے اور دیگر مغربی ناول نگاروں کے ادب تک رسائی حاصل کی۔ وہ ادلین عمر میں ڈکنز سے متاثر تھی، مگر ۲۰ سال کی عمر کے بعد اسے تھوڈور ڈریسر نے متاثر کرنا شروع کیا۔ سنکلیر لیوز کی کردار سازی، ایلن گلاسکو کی تجزیہ نگاری اور ڈریسر کی بنت، اسلوب اور تکنیک اسے پسند تھی۔ اب وہ خود اپنے افسانے کے لئے انداز اور اسلوب تلاش کرنے لگی اور اپنی پہلی کہانی THE CHINES WOMAN SPEAKS جریدے ایشیا کو بھیجی جو ۲۵ء میں شائع ہوئی۔ کہانی اس قدر پر تاثر تھی کہ ایک پبلشر نے اسے پیشکش کر دی کہ اگر وہ اس کہانی کو پھیلا کر ناول بنا دے تو اسے شائع کرنے پر تیار ہے۔ مگر کہانی اس قدر وسعت کی حامل نہ ہو سکتی تھی، پرل نے ایک اور طویل کہانی کے ساتھ اس کی اشاعت کے لئے کہا، مگر ناشر کے لئے یہ قابلِ قبول نہ تھا۔ یہ سال نانکنگ یونیورسٹی میں گزارنے کے بعد ۲۶ء میں وہ امریکہ آئی اور کارنل یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس چین آکر ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئیں۔ کارنل یونیورسٹی میں قیام کے دوران یونیورسٹی کے ایک مقابلہ تجزیہ نگاری کے تحت اس نے "چین اور مغرب" کے موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا جس پر اسے ۲۰۰ ڈالر انعام حاصل ہوا۔ اسی دوران اس نے نیو یارک کے پبلشر سے رابطہ قائم کیا اور اسے WINDS OF HEAVEN کا مسودہ بھیجا۔ مگر اس میں چینی روایات اور لوک حکایتوں کی بھرمار کے سبب پبلشر نے ترمیم کرنے کے لئے کہا۔ اس نے پورے ناول کو از سرِ نو تحریر کیا اور اس طرح EAST WIND, WEST WIND کے نام سے ۱۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو پرل کا پہلا ناول شائع ہو گیا۔ یہ ناول شائع ہوتے ہی اس قدر مقبول ہوا کہ ایک سال میں اس کے تین ایڈیشن چھاپنے پڑے اور پہلے ناول کے ساتھ ہی پرل امریکی ادبی آفاق پر تسلیم کر لی گئی۔

ناول ایک ایسی چینی لڑکی کوئی لان کی کہانی ہے جو چینی رسم و رواج پر سختی سے

کا ربت د خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس خاندان میں بچپن سے منگنی کر دینے کی رسم صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ ابھی کوئی لان پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی منگنی کر دی گئی تھی مگر اس کا خاوند جو جدید سائنسی تعلیم مغرب سے حاصل کر کے آتا ہے، ان قدیم رسومات کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بیوی کو غلاموں جیسی حیثیت دینے کی بجائے برابری اور دوستی کا مقام دینا چاہتا ہے بیوی کی روایتی اور سخت رسمی علائق میں تربیت کے سبب اسے یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ تضادات بڑھتے ہیں۔ بیوی اپنی ماں سے جا کر صورتِ حال بیان کرتی ہے، ماں حیران تو ہوتی ہے۔ مگر اس کے لئے خاوند کا حکم سب سے افضل ہے، وہ بیٹی سے کہتی ہے کہ وہ ہر صورت میں خاوند کی پابند رہے۔ بیوی خود کو تبدیل کرتی ہے اور میاں بیوی کے درمیان جدید دنیا کے مطابق تعلقات کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ بیوی کو سائنس کی تعلیم دیتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے لگتے ہیں۔

اس ناول کا دوسرا حصہ کوئی لان کے بھائی سے متعلق ہے، جو بچپن کی منگنی سے انحراف کر کے امریکہ چلا جاتا ہے۔ جہاں ایک لڑکی سے شادی کے لئے ماں کو لکھتا ہے جو اجازت نہیں دیتی مگر وہ امریکی لڑکی میری سے شادی کر کے اسے چین لے جاتا ہے۔ لڑکے کے والدین اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں پرل بتاتی ہے، کہ جب تک ماں یا باپ بچے کی شادی کی توثیق نہ کریں ان کی اولاد کو چین میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ایک نیا معاشرتی مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس دوران اس کی ماں مر جاتی ہے، باپ شادی کی توثیق سے انکار کرتا ہے اور مجبوراً کوئی لان کا بھائی گھر چھوڑ دیتا ہے مگر جب ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے نیک شگون قرار دیتے ہوئے اسے مشرق و مغرب کا سنگم قرار دیتے ہیں، جو ان کے نزدیک مشرق اور مغرب کو ان کے ماں باپ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی صلاحیت کا حامل ہوگا۔

کہانی بیانیہ اور ایک مکالمے میں سفر کرتی ہے۔ اس کا اسلوب سادہ اور کہانی کی

ہیئت اور تکنیک روایتی کہانی کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے، ساری کہانی ایک چینی لڑکی کے مکالمے میں بیان ہوتی ہے، جو اپنی دوست سے مخاطب ہے، اس کی دوست کی نظر میں مشرق و مغرب ہر دو آفاق واضح ہیں۔ مگر بعد میں آنے والے پرل کے ناولوں میں بیانیہ کا یہ انداز جدید تکنیک میں بتدریج بدلتا نظر آتا ہے۔ اس ناول کی اشاعت اور مقبولیت نے پرل میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ "امریکی قارئین چینی معاشرت کے بارے میں پڑھنا چاہتے ہیں۔" اب پرل نے اپنے نئے ناول پر کام شروع کیا جو ۲ مارچ ۱۹۳۱ء کو THE GOOD EARTH کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول میں پرل نے مظاہر فطرت کا شاندار مظاہرہ کیا۔

دی گڈ ارتھ ایک ایسے چینی خاندان کی زندگی کی کہانی ہے، جس کے پیچھے چینی تاریخ اور معاشرت بھرپور انداز میں اظہار کرتی ہے۔ پرل کے اس ناول کو امریکہ کی تاریخ کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے ناول کا مقام حاصل ہے، جو امریکہ کے علاوہ دُنیا کی تیس سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ خود چین میں اس کے سات ترجمے ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو کر دنیا کے ادب میں ایک نئی مثال بن گیا۔ ۱۹۳۲ء میں اس ناول کو امریکہ کا اہم انعام پلٹزر ایوارڈ PULTZER PRIZE ملا۔ کئی دوسرے انعامات کے علاوہ اس ناول نے پرل کو پہلی ایسی خاتون ناول نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا، جس کی تخلیقی صلاحیتوں کو امریکہ اور امریکہ سے باہر یکساں تسلیم کیا جانے لگا۔ اس ناول پر ایک فلم بنی جس میں LUISE RAINER PAULMURI نے شاندار کام کیا۔ اس حوالے سے امریکہ کے ساتھ چین میں غریب طبقوں کی طرف سے پرل کو شاندار خراجِ تحسین بھی پیش کیا گیا۔

"دی گڈ ارتھ" کا اسلوب نہایت جاندار، پُرکشش اور کردار سازی نہایت ہنرکاری کی دلیل ہے۔ اس اسلوب میں قدیم چینی لوک داستان کا انداز غالب ہے جس نے

کہانی کو عام سطح سے اوپر اٹھا کر غیر معمولی کہانی بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ ناول سادگی اور پرکاری کی شاندار مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ مغربی دنیا کے اکثر نقادوں نے اس کے اسلوب کو دیو مالائی SAGA قرار دیا اور اسے جدید عہد کے مسائل پیش کرنے کے لئے بہترین اسلوب بھی کہا۔

دی گڈ ارتھ کی کہانی مشترکہ خاندانی روایت پر استوار ہے جس کا محور اس خاندان کی تقدیر کے تجزیے کی نیابت کرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار وانگ لنگ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ وانگ کے کردار کو پرل نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی توانائیاں اور کمزوریاں آسانی کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہیں بظاہر وہ ایک سطحی کردار دکھائی دیتا ہے وہ جذباتی رویوں سے یکسر خالی ہے۔ وہ سادہ لوح اور شرمیلا مزاج رکھتا ہے۔ مگر زندگی کے مختلف مناظر میں اس کا کردار مختلف رویوں کے ساتھ دار د ہوتا ہے۔ کہیں وہ بزدل کہیں محتاط، کہیں کمزور، کہیں مضبوط، الغرض وہ متنوع جہات اور صفات کے ساتھ ایک مکمل کمپلیکس کے ساتھ ابھرتا ہے اور ایسے مزاج رکھنے والے کردار کی ہیئت کمال ہنرکاری کا مظاہرہ چاہتی ہے، جو پرل کے ہاں ارزاتی ہے۔

اسی طرح اولین کا کردار بھی پڑھنے والے پر شدید اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس کی مستقل مزاجی اور مسلسل چپ قاری کے ذہن کو بتدریج متاثر کرتا ہے۔ جو کہانی کے پس منظر میں واضح طور پر ادراک کا حصہ بنتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں چاہتی ہے۔ اس کا خاوند اس کی بیٹی اس کی ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور وہ اپنی زندگی سے صرف اس قدر مطالبہ کرتی ہے، دوسری طرف گھر میں کام کرنے والی عورت موش کے بارے میں اس کا احتجاج عین انسانی فطرت کی عکاسی کرتا ہے، جو نہ صرف ہر وقت تنقید کرتی ہے بلکہ سنگدلانہ مزاج کی حامل ہے۔ اولین اس عورت کے خلاف ہے، مگر وانگ بھی اس صورتِ حال میں کچھ بہتری نہیں لاسکتا۔

اس ناول میں اور بھی کردار ہیں جیسے وانگ کا باپ، جس کی کھانسی کی آواز سب سے پہلے وانگ کو سنائی دیتی ہے مگر ان دونوں جیسی گمبھیرتا اور کردار سازی کی معراج کے حلقے میں دوسرا کوئی کردار نہیں آتا۔

آسکر کارجل OSCAR CARGILL. اپنے ایک تنقیدی مضمون میں دی گڈ ارتھ کے ابتدائی حصہ اور ایملی زولا کے ناول ROUGHON MACQUART میں کچھ مشابہتی رشتوں کی بات کرتا ہے۔ کارجل ان دونوں کے حوالے سے کہتا ہے کہ "دونوں خاندان اپنے زمانی و مکانی علائق میں شناخت کراتے ہیں۔ وانگ ایک ایسے شخص کے طور پر سامنے آتا ہے، جس کی اپنی زمین کے لئے کچھ خواہشات ہیں۔ جو زولا کے کردار کی میڈم فیملی سائٹ کی حریصانہ مزاج کے برعکس ہے جو محبت خاندانی شور شرابے اور جنم پر زور دیتی ہے۔ پرل اور زولا دونوں تجارتی طبقے کے خلاف یکساں نفرت رکھتے ہیں۔"[۱۲]

پرل کے کردار وانگ پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ ایک بزدل اور کم تر درجے کا کردار ہے۔ مگر پرل کا کہنا ہے کہ "اگر کردار کو اس کے زمان و مکان سے باہر نکال کر دیکھا جائے گا، تو کرداروں سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ اسے آپ اس کے عصر میں ہی رکھ کر صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جدید دنیا کی "ڈرائنگ روم" سوسائٹی میں وہ یقیناً کم تر درجے کا آدمی ہے۔ وانگ کو ایسا ہی پورٹریٹ کیا گیا ہے جیسا کہ وہ تھا، وہ اپنی زندگی سے حقیقتاً وابستہ تھا۔"[۱۳] وانگ جس خواب آلودہ ماحول معاشرے کا فرد تھا، اس کی زندگی کا سارا ورثہ وہ اس کے تشخص کی شناخت میں سامنے رہنا چاہیئے۔ اس حوالے سے وانگ کا کردار مکمل اور حقیقی نظر آتا ہے۔

پرل کا رویہ نیچرل ازم کی طرف جھکاؤ کے باوجود اس تفصیلی جزئیات سے گریز کی طرف مائل ہے، جس کا مظاہرہ نیچرلسٹوں کے ہاں نظر آتا ہے۔ زولا اور پرل کے رویوں کا اصولی اختلاف اس کی آزادانہ روش ہے، جو دی گڈ ارتھ میں نظر آتا ہے۔ زولا کے جہان میں لوگ سماجی اور معاشی طاقتوں کے ہاتھوں پسے ہوئے اور انفرادیت سے محروم اور بے یار و مددگار

دکھائی دیتے ہیں، جبکہ پرل کے اس ناول میں آزادانہ روش مؤثر ہے۔ مثلاً جب وانگ کا
چچا اور اس کی بیوی اپنی بدقسمتیوں کا رونا روتے ہیں، تو وانگ انہیں کہتا ہے کہ "ان کی غربت
اور افلاس ان یا وہ گوئی اور قمار بازی کے سبب سے اپنے دوسرے غریب عزیزوں
کے برعکس وانگ کا عروج اس کی محنت شاقہ کے سبب اسے ملتا ہے۔"[۱۶]

پرل کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا
سکتا کہ وانگ اور اس کے دوسرے لوگ جس ماحول اور پس منظر میں زندہ ہیں، ان کے
افعال اور بدحالی کا ذمّہ دار وہ معاشرتی ڈھانچہ ہے، جس میں وہ سانس لے رہے ہیں —
جہاں معاشی اور معاشرتی طور پر زیردستوں پر بالادست مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ جہاں کی
عورت مکمل غلام عورت اور جہاں کا مرد مقہور و مجبور ہے اور یہ نتیجہ خود اس کے ناول
سے ابھرتے اور افراد کو مطعون کرنے کی بجائے اس معاشرت پر تنقید کرتے نظر آتے
ہیں، جس میں کم لوگ زیادہ لوگوں پر حکمرانی رکھتے ہیں۔

دی گڈ ارتھ کی غیر معمولی کامیابی اس کے لئے دو دھاری تلوار ثابت ہوئی۔ ایک طرف
اسے کامرانی، پیسہ، عزت اور شہرت ملی، دوسری طرف رقابت، حسد اور شدید تنقید
کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک ایسا ادیب جس نے آغاز میں ہی ایک بہت بڑا تخلیقی ادب پیش کر
دیا ہو، اس کے لئے بسا اوقات شہرت نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ خیال پرل کے
سامنے موجود تھا، اس لئے جہاں وہ خوفزدہ تھی، وہیں اپنی آنے والی تخلیق کے معیار کو اس
سے کم دیکھنے کی آرزومند نہ تھی۔ ٹھیک اس وقت چین میں جہاں یہ بہت بڑی تعداد میں
فروخت ہوئی تھی، وہیں تنقید نگاروں نے اس پر شدید حملے شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے
ناول میں پیش کئے جانے والے ماحول کو چینی ماحول کی غیر حقیقی تصویر قرار دیا۔ نیوری پبلک
میں شائع ہونے والے ایک تبصرے میں مصنّف کی غیر متوازن تصویروں سے مزیّن ناول
قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "اس میں مصنّف کے کردار غیر معقول اور ناموزوں مکالمہ کرتے نظر

آتے ہیں، جو روایتی مشرق کے برعکس ہے۔ کوئی فرد اپنی غلام کے ساتھ جنسی رابطہ قائم نہیں کرے گا اور اگر کوئی باپ ایسا کرے تو اس کے بچے اپنی تذلیل محسوس کرتے ہوئے خودکشی کرلیتے ہیں۔ چین میں نہ تو کوئی عام لڑکی نہ ہی غلام لڑکی شادی سے پہلے جنسی روابط قائم کرتی ہیں" پرل نے اس ساری تنقید کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ جواب دیا۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ پرل روایتی معانی میں ایک مذہبی مشنری عورت نہیں تھی، مگر ایک مشنری ماں باپ کی بیٹی اور زرعی مشنری خاوند کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مشینری جذبے کے ساتھ پڑھا رہی تھی اور ایک ایسے معاشرے میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزار چکی تھی۔ جہاں مذہب کی گرفت مضبوط تھی، چنانچہ ایک مذہبی مشنری نہ ہونے کے باوجود اس کی زندگی کے سارے رویے کا مشینری جذبے کے ساتھ ظاہر ہونا قدرتی امر تھا۔

۱۹۳۲ء میں نیویارک DAY پبلشرز کے تحت اس کی تخلیق SONS شائع ہوئی جو بلاشبہ سماجی اور تاریخی اقدار کے حوالے سے چینی معاشرت کی تصویر پیش کرتا ہے مگر وہ اس وژن کو نہ چھو سکا، جو" دی گڈ ارتھ" میں نظر آتا ہے اور ۱۹۳۳ء میں THE FIRST WIFE AND OTHER STORIES شائع ہوا۔ جبکہ اسی سال اس نے ایک چینی ادیب شوئی ہوچھن کے ناول "آل مین آر برادرز ——— ALL MEN ARE BROTHERS کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۱۹۳۴ء میں چینی سیاسی اعتبار سے اب غیر ملکیوں کے لئے تکلیف دہ ہوتا جارہا تھا دوسری طرف ڈاکٹر جان بک سے اس کی رفاقت میں رخنے پڑنے لگے تھے۔ چنانچہ اس نے مستقل طور پر امریکہ میں قیام کا فیصلہ کرلیا اور اکیلی نیویارک آگئی جہاں اس نے اشاعتی ادارے جان ڈے کمپنی میں بطور مدون ملازمت اختیار کرلی اور بعد ازاں جان لوزنگ بک سے طلاق لینے کے بعد ۱۱ جون ۱۹۳۵ء کو رچرڈ جے والش RICHARD J. WALSH سے شادی کرلی جو جان ڈے کمپنی کا سربراہ تھا۔ اسی سال اس کے تینوں ناولوں کو "دی ہاؤس

آف ارتھ" THE HOUSE OF EARTH کے نام سے ایک جلد میں شائع کیا گیا۔ اسی دوران اس کا عام تخلیقی روش سے ہٹ کر ناول شائع ہوا۔ THE MOTHER جس میں ایک آفاقی ماں کی تشکیل ہوتی نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ہی اسے امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز کی طرف سے بہترین تخلیقی ادب پیش کرنے پر ولیم ڈین ہوول میڈل WILLIAM DEAN HOWELL MEDAL دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اسے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز کا رکن منتخب کرلیا گیا۔ اس سے قبل اس کا ناول A HOUSE DIVIDED شائع ہوکر داد طلب کر چکا تھا۔ یہ ناول ایک ایسے نوجوان کے ذہنی ارتقا کی کہانی ہے جس نے جدید چین کے عہد کے بحرانوں اور بے چینی کے عہد میں آنکھ کھولی۔ جہاں خاندانی ڈھانچے میں تبدیلی کے آثار نسلوں آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں خاندانی اشتراک کی آخری تصویر اپنی بہترین اور بدترین ہر دو صورتوں میں بھرپور دکھائی دیتی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں اس کا ناول جلاوطن EXILE شائع ہوا۔ تحریری ترتیب کے اعتبار سے اس ناول کو پرل بک کا پہلا ناول کہا جاسکتا ہے۔ اسے اس نے اس وقت ہی لکھنا شروع کردیا تھا، جب ۱۹۲۱ء میں اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے دوران نانکنگ میں انقلابیوں نے غیرملکیوں پر حملے شروع کئے تو اسی میں خود پرل کا گھر بھی لوٹ لیا گیا، لیکن اتفاق سے جلاوطن کا مسودہ اس کے گھر میں واحد ایسی نادر شے تھی جو محفوظ رہ گئی تھی۔ بعدازاں اس ناول کو مزید بہتر کیا۔ مگر وہ ۱۹۳۶ء سے قبل شائع نہ ہوسکا۔ پرل کا کہنا ہے کہ سوائے کرداروں کے ناموں کے اس ناول کا ہر واقعہ امر واقعہ ہے کیونکہ اس کی کہانی اس کی ماں کے گرد گھومتی ہے۔ پرل کی والدہ ولندیزی تھی، لیکن مذہب (یہودیت) کے سبب اس کے خاندان کو ہالینڈ سے نکلنا پڑا اور امریکہ میں ہجرت کر کے ورجینیا میں آباد ہوگئے۔ کیرولین سٹلٹنگ ایک تلون مزاج عورت تھی۔ ایک طرف وہ خوش مزاج، مزاحیہ، ہنسوڑ

دجیہہ، خوبصورت اور تیزی سے سوچنے والی عورت تھی۔ وہ موسیقی اور گانے کا شوق رکھتی تھی۔ بچوں کے ساتھ کھیلتی دوڑتی پھرتی، مگر دوسری طرف اس کے اندر ایک سخت گیر مذہبی عورت بھی بس رہی تھی۔ اس کی نوجوانی کے دور میں ایک نہایت خوبصورت اور وجیہہ نوجوان اس کی زندگی میں داخل ہوگیا۔ دونوں کی شادی ہوسکتی تھی مگر اس نے اس لیے شادی سے انکار کر دیا کہ وہ شراب نوشی کرتا تھا۔ کیرولین کا خیال تھا کہ اگر وہ اس سے شادی کر لیتی تو اس جیسی ہو جاتی۔ کیونکہ اس نے بچپن ہی میں خدا سے عہد کیا تھا، کہ وہ اس کی ایک نیک سیرت خاتون بنے گی اور اس حوالے سے اس نے اپنی زندگی کو اپنے عہد کے مطابق گزارنے کی کوشش کی۔ چین میں اس کی زندگی کے شب و روز ایک مسلسل ایڈونچر کا شکار تھے۔ جس نے اس کی شخصیت میں کسی بھی ناول کے ہیرو بننے کے اوصاف بھر دیئے۔ باکسر باغی تحریک کے دوران انہیں جان بچا کر شنگنگ کی طرف بھاگنا پڑا۔ ایک اور موقع پر جب ابسلوم ایک تبلیغی دورے پر شہر سے باہر تھا، ان کے گھر کے دروازے پر ان کے خلاف مقامی لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس وقت وہ اس علاقے میں واحد خاندان تھا، جس کا تعلق سفید فام لوگوں سے تھا۔ جب آوازیں بڑھیں تو وہ باہر آئی۔ باہر لوگ کھڑے تھے۔ ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اس نے اپنے حواس مجتمع رکھے، بچوں کو اپنے گرد جمع کیا اور لوگوں کو چائے کی دعوت دی، لوگ حیران رہ گئے اور جلد ہی منتشر ہو گئے۔

جلاوطن بنیادی طور پر کچھ تکنیکی خامیوں سمیت کرداروں کے گہرے مشاہدے، تجربے اور بنت کا ایک بڑا ناول کہا جاسکتا ہے جو سوانحی ناولوں میں اہم قرار پاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں ہی ایک اور ناول جنگی فرشتے FIGHTING ANGEL جلاوطن کی نسبت زیادہ بہتر ناول ہے۔ جو اپنے معروض کو نہایت مناسب انداز میں فوکس کرتا ہے۔ پرل کا رویہ جہاں ماں کے ساتھ نہایت احترام، محبت اور ہمدردانہ تھا، وہیں باپ کے ساتھ کھردرا اور معروضی تھا۔ اس نے باپ کے سوانحی خاکے میں اس کی تندمزاجی اور کھردرے پن کو پوری شدتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ IN MEMORIAM میں پرل نے اپنے باپ کی مشنری زندگی کو

پورٹریٹ کیا ہے۔ ابسلوم مغربی ورجینا کے ایک دہقان کا بیٹا تھا۔ ۲۰ سال کی عمر تک وہ اور اس کے دوسرے بھائی باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے رہے۔ ابسلوم فرینکفرٹ اکیڈمی میں داخل ہوا۔ وہاں سے واشنگٹن پہنچا۔ جہاں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس وقت یہ ایک نہایت غریب نوجوان تھا۔ شرمیلا اور کم بولنے والا۔ شادی کے بعد کیرولین نے اسے اپنے مقاصد میں کامیابی دلانے کے لئے اسی کا بڑا ساتھ دیا۔ مگر اس کی ان تھک مصروفیات، خدمت گزار بیوی اچھے بچوں کے باوجود وہ ساری زندگی تنہا رہا۔ پرل نے باپ کی زندگی کے کئی واقعات پورے تخلیقی تنوع کے ساتھ FIGHTING ANGEL میں پیش کیے۔ پرل کے عصر کے نقاد اس پر متفق تھے کہ یہ دونوں سوانح عمریاں بہترین فسانی ادب کا حصہ ہیں۔

پرل ایس بک اب اپنی زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی تھی، جب شہرت کا بین الاقوامی آفاق در وا کئے اس کا منتظر تھا۔ اس نے اب تک اپنے ناولوں اور افسانوں میں چینی سرزمین اور وہاں کے لوگوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ امریکی ادبی دنیا میں اس کی شناخت بھی اب تک اس حوالے سے تھی۔ چین میں قیام کے دوران اس نے سفید فاموں کی ایکسپلائیٹیشن کو بچی آنکھوں سے دیکھا تھا، چنانچہ سفید فام قوم کے تجارتی مقاصد کے پیچھے چھپے مقاصد سے اسے سخت نفرت تھی۔ اسی لئے اس نے چین کی زندگی کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا، اور تمام ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ کیں۔ مگر ۱۹۳۲ء کے بعد جب کمیونسٹ تحریک نے زور پکڑا اور جاپان نے منچوریا پر حملہ کیا۔ اور پھر ان حملوں کا سلسلہ بڑھنے لگا، تو پرل نے اندازہ لگا لیا کہ اب اس دھرتی پر سفید فاموں کے لئے زیادہ دیر رکن آسان نہیں ہوگا۔ ان دنوں اس کا بیمار بیٹا امریکہ میں تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر جان لوزنگ بک سے اس کی شادی اس کی خوشیوں میں نہ بدل سکی تھی۔ چنانچہ دونوں نے یہی سوچا کہ الگ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ امریکہ آ کر جان لوزنگ بک کے شہر پنسلوینیا میں ایک مکان خرید کر رہنے لگی اور یہیں واش سے

شادی کرلی۔ اب اس نے چینی زندگی پر ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی معاشرت کو بھی اپنا موضوع بنانا شروع کیا اور پہلا ناول NOR AND FOR EVER لکھ کر امریکی معاشرت کے درون ذات جھانکنے لگی۔

لیکن امریکی زندگی کے حوالے سے اس کی زیادہ سنجیدہ تحریر THE PROUD HEART ہے جس میں سوسن کیلارڈ کے کردار کو غیر معمولی طور پر مکمل اور شاندار انداز میں تحریر کیا ہے ۔ سوسن پر اس چیز کو اپنی زندگی کا تجربہ نہیں چاہتی ہے جو اس کے بس میں ہے۔ اس کے والدین، خاوند، بچے اس کا کیریئر اس کے لئے کوئی وجود نہیں رکھتے، جو اس کے اطمینان کے لئے بہت ہے۔ سوسن کے کردار کے گہرے اثرات قاری کے ذہن تک پوری شدت کے ساتھ منتقل ہوئے ہیں وہ خاوند سے محبت کرتی ہے، مگر وہ اپنے پورے وجود کا جس طرح خاوند سے ادراک چاہتی ہے اس میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ اسی دوران سنگ تراش ڈیوڈ سوسن کو یقین دلاتا ہے کہ وہ قدرت اور ذہانت کا ایک عطیہ ہے۔ وہ سوسن میں کمال فن دیکھ کر اسے فرانس جا کر مجسمہ سازی کا مشورہ دیتا ہے۔ مگر وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی جب کا اس کا فطری میلان تربیت کا متقاضی تھا۔ مجسمہ سازی کے وقت وہ تخلیقی دبران میں اس طرح ڈوب جاتی کہ اس کو اپنا ہوش نہ رہتا۔ اس کے باوجود وہ کبھی کسی ایک معروض کو یک ذہنی رو کے ساتھ شروع نہ کر سکی، جس سے وہ اعلیٰ درجے کی فنکارانہ تکمیلیت کو حاصل کر سکتی ہے BRIDGE OF PASSING میں پرل ایس بک اپنے متعلق کہتی ہے" میں اپنی ذات میں دو وجود رکھتی ہوں، ایک وجود عورت ہے جبکہ دوسرا تخلیق کار۔ میرا تخلیقی وجود میرے عورت کے وجود سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ جہاں ایک طرف ایک بھرپور زندگی گزارنے کی خواہش مند نظر آتی ہے، وہیں اس کا فن اس کی ذات کے اطمینان کی مکمل نیابت کرتا ہے۔

یہ ناول جس کا کردار پرل کی زندگی سے کئی طرح مماثلتیں رکھتا ہے، اصلاً ایک فنکار کی دانشورانہ سطح پر موجود عصر کے علائق میں اس کی خواہشات کا اظہار بھی ہے اور عصر کی جنسیں

کے ادراک کی نیابت فکر بھی۔

۱۹۳۸ء کا سال اس کے لئے ایک تازہ پیغام لے کر آیا۔ جب وہ دنیا کے ان خوش نصیبوں میں شامل ہوگئی جنہیں ادب کے نوبیل پرائز کا حقدار قرار دیا گیا تھا۔ وہ دنیا کی ۳۵ ویں، امریکہ کی تیسری اور امریکی خواتین میں پہلی ادیبہ تھی، جسے نوبیل پرائز دیا گیا۔

سویڈش اکیڈمی کے مستقل سیکرٹری اور نوبل کمیٹی کے چیئرمین اینڈرز آسٹرلنگ ANDERS OSTERLING کہتے ہیں:

نوبیل کمیٹی کے ججوں کے سامنے یوں تو پرل ایس بک کا دوسرا تخلیقی کام بھی تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ مشنری جوڑے (پرل کے والد اور والدہ) کی سوانح عمریاں یقیناً کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔

آسٹرلنگ نے اس کے ناول EAST WIND WEST WIND کی بھی تعریف کی اور اس بات کا اعتراف کیا کہ اس ناول کے ذریعے چینی معاشرت کے بہت سے گمشدہ گوشے مغربی دنیا پر عیاں ہوئے۔

مگر نوبیل پرائز کے اعلان سے امریکی حلقوں میں شدید کھلبلی مچ گئی اور پرل ایس بک کے خلاف تنقید کا ایک شدید ریلہ آیا۔ انعام کے اعلان کو سیاسی، جانبدارانہ اور نامناسب قرار دیا گیا۔ پرل کے کام کو نوبیل پرائز کے لئے ناکافی اور امریکہ سے زیادہ چینی معاشرت کی نمائندہ کہا گیا۔ خاص طور پر ہمینگوے اور جان سٹین بک کی موجودگی میں، جو امریکی ادبی منظر نامے پر چھائے ہوئے تھے، پرل کو ملنے والے انعام نے خود اس کی پوزیشن کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ وہ محفلوں میں جانے سے گریز کرنے لگی، امریکہ کے تقریباً تمام حلقوں میں اس کے خلاف تنقید کا سلسلہ جاری تھا۔ جب کہ چند ایسے ادیب تھے جو اس فیصلے کو درست قرار دے رہے تھے۔ ان میں پہلے امریکی نوبل یافتہ ادیب سنکلیر لیوس بھی تھا۔ پرل ایس بک نے نوبیل پرائز حاصل کرتے ہوئے جو تقریر کی، اس میں چند باتیں بڑی اہم تھیں۔ اس نے چین کے معاشرتی، معاشی ڈھانچے

کے علاوہ ادبی منظرنامے پر طویل بات کی اور بتایا کہ چینی عوام تحرک اور عمل کے ادب کو پسند کرتے ہیں۔ اس نے اسی لئے چینی ناول کی روایتی تکنیک کو اپنایا تاکہ اس کے پڑھنے والوں کا دائرہ وسیع ہو اور اس میں اس نے بنیادی انسانی اصولوں کو اپنا محور بنا لیا۔ ناول کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں بقول پرل، اس نے اپنے نظریے یا رویوں کو ٹھونسنے کی بجائے حقیقت اور حقیقی فطری مظاہر کو پیش کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۳۹ء میں اس کا نیا ناول محبِ وطن PATRIOT شائع ہوا جس سے یہ پتہ چلا کہ نوبیل انعام نے پرل کے فن کو کمزور نہیں کیا، بلکہ ابھی مزید اوپر اُٹھ رہا ہے۔ پرل اس ناول میں ایک بار پھر بھرپور تخلیقی قوتوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ناول کا لینڈ سکیپ تیسرے عشرے کا شنگھائی ہے۔ جب چیانگ کائی شیک کی قوم پرستانہ تحریک نے شنگھائی کے در و دیوار کو ہلا دیا تھا۔ ناول کا مرکزی کردار آئیون یونیورسٹی کا طالب علم اور ایک بنک کے سربراہ کا بیٹا ہے۔ یونیورسٹی میں قوم پرست تحریک کا آغاز ہو چکا ہے اور نوجوانوں کی ایک بڑی اکثریت قوم پرستانہ جوش و جذبے کے ساتھ چیانگ کائی شیک کی قیادت کو تسلیم کرتی نظر آتی ہے۔ آئیون کا دوست انقلابی نوجوان این لان کی باتیں اسے بھی تحریک میں لے جاتی ہیں۔ دونوں دوست بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ تحریک میں کام کرتے ہیں اور جب مزدوروں کی شرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو آئیون اور این لان دونوں کوشش کر کے شنگھائی سلک ملز میں ہڑتال کرانے اور چیانگ کائی شیک کی تحریک کو کامیاب کرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر بعد ازاں چیانگ کائی شیک سرمایہ داروں اور جاگیر طبقوں سے سمجھوتہ کر لیتا ہے اور قوم پرست نوجوانوں کی گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ آئیون کا باپ چونکہ ایک بنک کا صدر ہوتا ہے، وہ کوشش کر کے اپنے بیٹے کو ملک سے نکال جانے میں مدد دیتا ہے اور آئیون جاپان جا کر وہاں ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے وہیں ایک جاپانی

لڑکی سے شادی کر کے خود کو سیاسی طور پر الگ تھلگ کر لیتا ہے۔

خاصا عرصہ بیت جاتا ہے۔ اسی دوران جاپان چین پر حملہ کر دیتا ہے اور منچوریا ٹیک چلا جاتا ہے مگر جاپان میں جاپان کی جارحیت کی خبریں شائع نہیں ہوتی اور اگر خبر آتی بھی ہے تو یک طرفہ۔ ایک روز اس کی بیوی کا بھائی اسے کچھ باتیں بتاتا ہے اور آخر میں خود آئیوان کا بھائی اسے جاپانی جارحیت کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہے۔ آئیوان کے اندر ایک بار پھر قوم پرستی کا ولولہ اٹھتا ہے اور وہ جاپان سے واپس آ کر آزادی کی جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس دوران چیانگ کائی شیک اور انقلابی اپی سن یا سن کے درمیان ایک سمجھوتے کے نتیجے میں دونوں مشترکہ طور پر جاپان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر جاپان ایک سیلاب بلا کی طرح شہروں کو روندتا آگے بڑھتا ہے۔ چیانگ کائی شیک کی فوجیں پسپا ہوتی ہیں۔ سن یات سن اپنی گوریلا جنگ کے ذریعے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مگر جاپان آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ برما کی طرف جانے والی سڑک تک پہنچ جاتا ہے اور ناول یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

چین اپنی تاریخ میں موجودہ اوّلین صدی خصوصاً تیسرے اور چوتھے عشرے میں جن حالات سے گزرا ہے، پرل کا یہ ناول ان حالات کے پس منظر میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور جدوجہد کی تاریخ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ پرل ایس بک نے بیانیہ انداز میں امید اور امکانات کی ایک دنیا ابھرتے ہوئی دکھائی ہے۔ آزادی کی تحریکوں کے حوالے سے چیانگ کائی شیک موقع پرستانہ رویے کی خوبصورت تصویریں بناتا ہے۔ ناول کے پہلے حصے کے برعکس جہاں ایک نیا اور بے چین چین ابھرتا نظر آتا ہے۔ دوسرے حصے میں آئیوان کی زندگی اور مشاہدے کے حوالے سے پرل ایس بک جاپان کی معاشرت لوگوں کے احساسات و جذبات اور ملک کے ساتھ ان کی غیر مشروط وابستگی کو زیرِ بحث لایا ہے۔ جاپانی لوگوں میں حُبّ الوطنی، فرائض میں تندہی اور خلوص، حسن اور خوبصورتی سے ان کا لگاؤ بھرپور تشخص کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ملک سے والہانہ لگاؤ کی ایک مثال ٹوماماراکی کا یہ جملہ ہے کہ " میں اپنی ذات سے

نہیں اپنے ملک سے تعلق رکھتی ہوں"۔ چینیوں کی وطن دوستی کا ایک اہم ثبوت ہے۔
زندگی کے ان تجربوں سے آئیوان چین اور جاپان کے درمیان تعلقات اور فرق کا شعور
حاصل کرتا ہے۔ یہیں پرل نے دونوں ملکوں کی قیادت پر بھی تنقید کی ہے اور دونوں کو
غیر مدبر، ناقص اور غیر مؤثر قیادت قرار دیا۔ ناول کے تیسرے حصہ میں آئیوان کی وطن واپسی اور
چیانگ کائی شیک کے ساتھ مل کر جاپانی یلغار کو روکنے کے جنگ میں شرکت کرنا اور
بعد ازاں، مایوس ہو کر سن یات سن اور رین لان کی گوریلا فوج میں شامل ہو کر جاپان کے خلاف
جنگ میں نئے انداز سے شرکت پر اختتام پاتا ہے۔

یہ ناول بنیادی طور پر چین کے نفسیاتی و درسیاسی حالات کے پس منظر میں آزادی کی
تحریکوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں اس کا ناول THE OTHER GODS
شائع ہوا۔ اس دوران پرل ایس بک نے دوسری جنگِ عظیم میں امریکی مداخلت سے قبل کی
صورتِ حال میں ادبی تخلیقات کے علاوہ مضامین، ڈراموں اور دیگر سرگرمیوں کے ساتھ بھی
حصہ لیا، اسی دوران یونیورسٹی سے ریڈیو ڈرامے میں تربیت حاصل کی اور جنگ کے دوران
اس موضوع پر خوب لکھا۔ ۱۹۴۱ء میں اس نے ایک تنظیم ایسٹ اینڈ ویسٹ ایسوسی ایشن
EAST AND WEST ASSOCIATION بنائی اور ساتھ ہی مضامین، تقاریر،
مذاکروں اور مناظروں کے ذریعے جنگ کے اصل حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔ اس کے مضامین
میں TENDER FOR TOMORROW بڑا مقبول ہوا۔ اسی دوران اس کے دو
مضامین خاصے پسند کیے گئے جن میں سے ایک "ہم مشرق میں کسی کے لئے لڑ رہے ہیں" اور
دوسرا "آزادی ــــ سب کے لئے" خوب تھے جن میں اس نے نوآبادیت اور عدم مساوات
کے خلاف بڑے زور دار دلائل دیئے۔ وہ خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ کے اس رویے پر
شاکی تھی کہ وہ دنیا کے چھوٹے ممالک خصوصاً چین کو برابری کا درجہ کیوں نہیں دیتے۔
۱۹۴۲ء میں اس کا نیا ناول DRAGON SEED شائع ہوا۔ یہ ناول نانکنگ کے

کے قریبی دیہی علاقوں کے لوگوں سے متعلق ہے، جس کا فوکس ایک کسان گھرانہ ہے۔ جاپانی حملے کے دوران وہ پہلی بار سنتے ہیں کہ جہازوں کے ذریعے نیچے گولے پھینک کر تباہی لائی جا سکتی ہے۔ وہ ہر روز ایسی خبریں سنتے اور حیران ہوتے۔ ۱۹۴۳ء میں PROMISE شائع ہوا جو ڈریگن سیڈ کی نسبت زیادہ شدتوں سے عبارت تھا۔

پرل ایس بک کی تمام تر کوششوں کے باوجود امریکی تنقیدی منظر نامے پر اس کی قبولیت بدستور مشکوک تھی، تنقیدی حلقوں کی طرف سے اس پر یہ مسلسل الزام عاید کیا جاتا رہا کہ وہ امریکی معاشرت کی بجائے چینی سرزمین کی نمائندہ ہے اور وہ امریکی سوسائٹی کے بارے میں نہیں لکھ سکتی۔ پرل کے ذہن میں یہ تاثر موجود تھا کہ وہ امریکی معاشرت پر لکھنے کے باوجود وہ مقام حاصل نہ کر سکے گی، جو وہ چینی تجربات کو استعمال کر کے حاصل کر چکی ہے چنانچہ اس نے فیصلہ کیا اور ایک جان سیجز JOHN SEDGES کے نام سے امریکی معاشرت کو موضوع بنا کر لکھنا شروع کیا اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۳ء کے عرصے میں یکے بعد دیگرے ۶ ناول جان سیجز کے نام سے بازار میں آئے۔ ظاہر ہے وہ اتنی شہرت حاصل نہ کر سکے، مگر ان میں سے ایک THE TOWNSMAN پسند کیا گیا۔ اس ناول میں پرل کے دیگر ناولوں کی نسبت نہ صرف پس منظر بدل گیا تھا، بلکہ کردار، کرداروں کی نفسیات، معاشرتی دروبست۔ کہانی کی ہر شئے نئی تھی جس کے سبب ان ناولوں کا اسلوب بھی نئے انداز سے اُبھر کر سامنے آیا اور کوئی شخص یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ ناول خود پرل ایس بک نے تحریر کئے، حالانکہ ۱۹۵۸ء میں خود اس نے اعلان کیا کہ وہ جان سیجز کے نام سے لکھتی رہی ہے اور یہ ثابت کیا کہ وہ امریکی عوام کی زندگیوں پر بھی لکھ سکتی ہے کیونکہ "عوام، عوام ہوتے ہیں وہ امریکہ کے ہوں یا ایشیا کے"۔

۱۹۵۶ء اور ۵۸ء کے دوران ٹیلی ویژن کے لئے اس نے کئی ڈرامے تحریر کیے پہلا ڈرامہ THE BIG WAVE لکھا جو ۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء کو ٹیلی کاسٹ ہوا۔

۱۹۵۱ء میں اسے امریکن اکیڈمی آرٹس اینڈ لیٹر کی رکن منتخب ہوئی۔ وہ اکیڈمی کے ۵۰ ارکین میں سے دوسری خاتون تھی، جو اس عہدے کے لئے چنی گئی۔ اسے نوبل اور پیٹزر ایوارڈ کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگریاں بھی دی گئیں۔ ۱۹۵۴ء میں وہ اپنی آپ بیتی بھی لکھ چکی تھی۔ ان کا انتقال ۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو ہوا مگر ان کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۷۹ء تک جاری رہا۔ گو پرل سائیڈن سٹرائیکر بک اپنی زندگی میں بہت سے نقادوں کی طرف سے نظرانداز کی گئی اور دنیا کے ادب کے بڑے حلقے میں کبھی قبولیت حاصل نہ کر سکی لیکن بے شمار ناولوں، افسانوں، مضامین، ڈراموں اور بچوں کی تحریروں میں کم از کم تین ایسے اعلیٰ پایے کی تخلیقات موجود ہیں جنہیں امریکی ادب میں بڑی جگہ ملی ان میں THE GOOD EARTH خاص طور پر ایسی تخلیق ہے، جس میں خوبصورت انداز میں ایک یورپی معاشرت سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دیگر کتب اپنے مخصوص پس منظر میں نہ صرف اسے ایک غیر متنازعہ ادیبہ بنانے میں مدد دیتی ہیں، بلکہ اس کے نظریہ فن کی تشکیل میں نہایت مددگار فکر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس نے اپنے ناولوں اور کہانیوں کے لئے قدیم گوئی کا بھی نیا انداز اپنایا۔ اس کے باوجود کہ اس انداز پر تنقید ہوئی اور جدید اسلوب زیادہ مقبول بھی تھا، اس نے مستقل استقامت کے ساتھ اپنے اسلوب اور انداز کو برقرار رکھا۔

پرل ایس بک کے نظریۂ فن پر بات کرتے ہوئے مغربی نقادوں نے اسے انسان دوست مصنف قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس نے تھیوڈور ہیرس THEODOOR HARSIS سے گفتگو کرتے ہوئے، اپنے اوپر لیبل" لگانے سے انکار کیا تھا، مگر یہ اصطلاح پوری طرح اس پر صادق آتی ہے ویسے انسان دوستی کا یہ رویہ اور نسلی امتیازات سے نفرت کا آغاز اس کے بچپن سے نظر آتا ہے۔ مگر باکسر باغیوں کی تحریک اور قوم پرستوں کی جدوجہد کے دور میں اس کی انسان دوستی کے رویے زیادہ واضح نظر آرہے ہیں۔"[9]

حوالہ جات

۱۔ PAUL A. BOYLE
"PEARLS BUCK"
TWAYNE PUB
BOSTON 1980 P-15

۲۔ ایضاً

۳۔ شنگھائی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی تک اپنے قحبہ خانوں کے لئے مشہور تھا۔ ان قحبہ خانوں میں چین کے "غلام نظام" کے تحت اور بھوک ننگ، قحط اور غربت کے سبب بڑی تعداد چینی عورتوں کی تھی۔ جبکہ اغوا شدہ اور جہازیوں کے پہنچنے والی عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان قحبہ خانوں کی رونق تھی۔ مگر ماوزے تنگ کی قیادت میں آنے والے انقلاب کے بعد یہ قحبہ خانے بند کر دیئے گئے اور عورتوں کو باعزت پیشوں میں لگا دیا گیا۔

۴۔ یونیورسٹی ہر سال مختلف موضوعات پر مقالات لکھوایا کرتی تھی۔ جس سے نئی نسل کی فکری جہتوں کا پتہ لگانا مقصود ہوتا تھا۔ اس سال جب موضوع پر لکھنے کا مقابلہ ہوا۔ موضوع تھا "معیشت اور تجارتی حکمتِ عملی"۔ پرل ایس بک نے چین کے حوالے سے نہایت مدلل مقالہ تحریر کر کے مقابلہ جیت لیا۔ پرل کا موضوع تھا "چین اور مغرب"۔

OSCAR CARGILL.

"INTERNATIONAL AMERICA IDEAS OF MARCH"

MACMILLAN NEW YORK 1941 P-149

۹ھ PAUL DYLE P-39

۷ھ YOUNGHILL.

"GOOD EARTH"

1. JULY 1931 P-185

NEW REPUBLIC (USA)

۸ھ POUL DYLE P-129

ٹھیا ٹھ

Pearl S. Buck

Bibliography

Fiction

East Wind, West Wind. New York: Day, 1930.

The Good Earth. New York: Day, 1931.

Sins. New York: Day, 1932.

The First Wife and Other Stories, New York: Day, 1933.

The Mother. New York: Day, 1934.

A House Divided. New York: Reynal and Hitchcock, 1935.

House of Earth (trilogy of *The Good Earth, Sons, A House Divided)*. New York: Reynal and Hitchcock, 1935.

This Proud Heart. New York: Reynal and Hitchcock, 1938.

The Patriot, New York: Day, 1939.

Other Gods: An American Legend. New York: Day, 1940.

Today and Forever: Stories of China. New York: Day, 1941.

China Sky. Philadelphia: Triangle, 1942.

Dragon Seed. New York: Day, 1942.

The Promise. New York: Day, 1943.

China Flight. Philadelphia: Triangle, 1945.

Portrait of a Marriage. New York: Day, 1945.

The Townsman (as John Sedges). New York: Day, 1945.

Pavilion of women. New York: Day, 1946.

The Angry Wife (as John Sedges). New York: Day, 1947.

Far and Near: Stories of Japan, China and America. New York: Day, 1947.

Peony. New York: Day, 1948.

Kinfolk. New York: Day, 1949.

The Long Love (as John Sedges). New York: Day, 1949.

God's Men. New York: Day, 1951.

The Hidden Flower. New York: Day, 1952.

Bright Procession (as John Sedges). New York: Day, 1952.

Voices in the House (as John Sedges). New York: Day, 1953.

Come, My Beloved. New York: Day, 1953.

Imperial Woman. New York: Day, 1956.

Letter from Peking. New York: Day, 1957.
Command the Morning. New York: Day, 1959.
Fourteen Stories. New York: Day, 1961.
Satan Never Sleeps. New York: Pocket Books, 1962.
Hearts Come Home and Other Stories. New York: Pocket Books, 1962.
The Living Reed. New York: Day, 1963.
Stories of China. New York: Day, 1964.
Death in the Castle. New York: Day, 1965.
The Time is Noor. New York: Day, 1967.
The New Year. New York: Day, 1968.
The Three Daughters of Madame Liang. New York: Day, 1969.
The Good Deed and Other Stories of Asia, Past and Present. New York: Day, 1969.
Mandala. New York: Day, 1970.
The Goddess Abides. New York: Day, 1972.
All Under Heaven. New York: Day, 1973.
East and West. New York: Day, 1975.
Mrs. Stoner and the Sea and Other Works. New York: Ace, 1976
This paperback contains nine short stories and three new essays, including "What I Believe," and "What I Wish for America." All twelve items copyrighted in the 1970s. *Secrets of the Heart*. New York: Day, 1976.
The Lovers and Other Stories. New York: Day, 1977.
The Woman Who Was changed and Other Stories. New York: Crowell, 1979.
The Young Revolutionist (juvenile). New York: Day, 1932.
Is There a Case for Foreign Mission? New York: Day, 1932.
East and West and the Novel: Sources of the Early Chinese Novel. Peking: North China Union Language School — California College in China, 1932.
All Men Are Brothers (translation of Shui Hu Chuan). New York: Day, 1933.
The Exile. New York: Reynal and Hitchcock, 1936.
Fighting Angel. New York: Reynal and Hitchcock, 1936.
The Chinese Novel. New York: Day, 1939.
Stories for Little Children. New York: Day, 1940.
Of Men and Women. New York: Day, 1941 [Reissued in 1971 with a new epilogue]

American Unity and Asia. New York: Day, 1942.
Pearl Buck Speaks for Democracy. New York: Common Council for American Unity, 1942.
The Chinese Children Next Door, (juvenile). New York: Day, 1942.
The Water Buffalo Children (juvenile).New York: Day, 1943.
What America Means to Me. New York: Day, 1943.
The Sprit and the Flesh (*The Exile* and *Fighting Angel* in one volume). New York: Day, 1944.
The Story of Dragon Seed. New York: Day, 1944.
The Dragon Fish (juvenile). New York: Day, 1944.
Tell the People: Talks with James Yen about the Mass Education Movement. New York: Day, 1945.
Yu Lan: Flying Boy of China (juvenile).New York: Day, 1945.
Talk about Russia, with Masha Scott. New York: Day, 1945.
China in Black and White: An Album of Woodcuts by Contemporary Chinese Artists (editor). New York: Day, 1945.
How It Happens: Talk about the German People, 1914-1933 (in collaboration with Erna von Pustau). New York: Day, 1947.
The Big Wave (juvenile). New York: Day, 1948.
American Argument (in collaboration with Eslanda Goode Robeson). New York: Day, 1949.
The Child Who Never Grew. New York: Day, 1950.
One Bright Day (juvenile). New York: Day, 1950.
The Man Who Changed China: The Story of Sun Yat Sen (juvenile). New York: Random House, 1953.
Johnny Jack and His Beginnings (juvenile). New York: Day, 1954.
My Several Worlds. New York: Day, 1954.
The Beech Tree (juvenile). New York: Day, 1955.
Christmas Miniature (juvenile). New York: Day, 1957.
Friend to Friend (in collaboration with Carlos Romulo). New York: Day, 1958.
The Delights of Learning. Pittsburgh: University of Pittsuburgh Press, 1962.
The Christmas Ghost (juvenile). New York: Day, 1960.
A Bridge for Passing. New York: Day, 1962.
Welcome Child (juvenile). New York: Day, 1964.
The Joy of Children. New York: Day, 1964.
Fairy Tales of the Orient (editor). New York: Simon & Schuster, 1965.
Children for Adoption. New York: Random House, 1965.

The Gifts They Bring: Our Debt to the Mentally Retarded (in collaboration with Gweneth T. Zarfoss). New York: Day, 1965.

The Big Fight (juvenile). New York: Day, 1965.

My Mother's House (in collaboration with others). Richwood, West Virginia: Appalachian Press, 1965.

For Spacious Skies: Journey in Dialogue (in collaboration with Theodore F. Harris). New York: Day, 1966.

Essay on Myself and *A Study of Pearl S. Buck* by Jason Lindsey. New York: Day, 1966.

The People of Japan. New York: Simon & Schuster, 1966.

The Little Fox in the Middle (juvenile). New York: Macmillan (Collier Books), 1966.

To My Daughters, With Love. New York: Day, 1967.

Mathew, Mark, Luke and John (juvenile). New York: Day, 1967.

Elements o Democracy in the Chinese Traditional Culture.

Jamica. New York: Centre of Asian Studies, St. John's University, 1969.

The Kennedy Women: A Personal Approach. New York: Cowles-Day, 1970.

China I See It (edited by Theodore F. Harris). New York: Day, 1970.

The Story Bible. New York: Bartholomew House, 1971.

The Chinese Story Teller (juvenile). New York: Day, 1971.

Pearl Buck's America. New York: Bartholomew House, 1971.

China: Past and Present. New York: Day, 1972.

A Community Success Story (in collaboration with Elisabeth Weachter). New York: Day, 1972.

Once Upon a Christmas. New York: Day, 1972.

Pearl Buck's Original Cookbook. New York: Simon & Schuster, 1972.

A Gift for the Children (juvenile) New York: Day, 1973.

Mrs. Starling's Problem (juvenile). New York: Day, 1973.

Words of Love. New York: Day, 1974.

Pearl S. Buck's Book of Christmas (editor). New York: Simon & Schuster, 1974.

BARNES, ANNE. "They Have Their Exits." *TLS*, November 5, 1976, p. 1405. A review of *The Rainbow* which emphasizes the melodrama of Buck's last novel and the wooden quality of the characters.

BARTLETT, ROBERT M. "East and West — One World: Pearl S. Buck," in *They Work for Tomorrow*, New York: Association Press and

Fleming H. Revell, 1943, pp. 32-40. Stresses the need for the Western and Asiatic people to become acquainted with each other and see their common goals and needs.

BENTLEY, PHYLLIS. "The Art of Pearl S. Buck," *English Journal*, 24 (December 1935), 791-800. A poineering, perceptive, and appreciative study of Pearl Buck's handling of scene, style, characterization, plot, and theme.

BIRMINGHAM, FREDERIC A. "Pearl Buck and The Good Earth of Vermont." *Saturday Evening Post*, Spring 1972, 70-73, 135, 139, 141, 143-44. Visits Buck in Vermont and interviews her. Discusses how she helped restore the beauty and economy of Danby, Vermont; presents a ladatory analysis of her stately and kindly character and gives a commentary on her philosophy of life and various literary, humanitarian activities.

BLOCK, IRWIN. *The Lives of Pearl Buck.* New York: Thomas Y. Crowell Co, 1973. Written for young adults, this volume gives a good brief exposition of biography basics and highlights. It is especially informative about Buck's relationship with her husbands and with Ernest Hocking.

BRENNI, VITO. "Pearl Buck: A Selected Bibliography," *Bulletin of Bibliography*, 22 (May-August 1957), 65-69; (September-December, 1957), 94-96. Particularly helpful checklist of Buck's articles in periodicals and edited collections up to 1955. Superseded by Zinn's checklist.

CANBY, HENRY SEIDEL. "*The Good Earth:* Pearl Buck and the Nobel Prize," *Saturday Review of Literature*, November 19, 1938, 8. Brief, succinct, and balanced essay on the pros and cons of the awarding of the Nobel Prize to Pearl Buck.

CARGILL, OSCAR. *Intellectual America: Idea on the March.* New York: Macmillan, 1941; New York: Cooper Square publishers, 1968, pp. 146-54. Considers Buck's relationship to the Naturalists.

CARRASCAL, JOSE MARA. "Pearl S. Buck a sus setentay siete anos," La Estafeta Literaria, No. 432, November 15, 1969, pp. 14-15., Buck's popularity is due to her clear style and exotic themes.

CARSON, E.H.A. "Pearl Buck's Chienese," Candian Bookman, 21 (June-July 1939), 55-59, Provocative, balanced account of Pearl Buck's career up to 1939.

CAVASCO, GEORGE A. "Pearl Buck and the Chinese Novel," *Asian*

Studies, 5 (December 1967), 437-50. A perceptive analysis of the characteristics of Buck's Chinese fiction. Believes that novels like *The Good Earth*, *The Mother*, *Dragon Seed*, and *The Patriot* will always retain theri appeal.

"Reviews" *Chinese Culture*, 6 (October 1965). 10is7-09. A review-essay praising Don-Cao-Ly's book. Believes that this volume is very helpful in giving readers a more intimate understanding of Buck's characters and the world she portrays.

COOPER, ALICE C. and CHARLES A. PALMER. "Pearl S. Buck: East Meets West," in *Twenty Modern Americans*. New York: Harcourt, Brace, 1942, pp. 292-307. Deals almost exclusively with biographical details.

COURNOS, JOHN and SYBIL NORTON. "Pearl Sydenstricker Buck ——Interpreter of the East," in *Famous Modern American Novelists*. New York: Dodd, Mead and Co., 1952, pp. 85-91. Focuses on biographical data; contains no significant literary criticism.

COWLEY, MALCOLM. "Wang Lung's Childrn," *New Republic*, May 10, 1939. 24-25. A review-article primarily concerned with *The Patriot* but discussing most of Pearl Buck's work.

DICKTEIN, LORE. "Posthumous Stories," *New York Times Book Review*, March 11, 1979, Sect. 7, pp. 20-21. Buck is part of the history of China because she chronicles the era from the old dynasty to the modern state and made China live for American readers. Maintains that she is more interesting as a person than as writer.

DOAN-CAP-LY. *The Image of the Chinese Family in Pearl Buck's Novels*. Saigon: Duc-Sinh, 1964. Emphasizes Buck's firsthand knowledge of Chinese settings and the authenticity of her scenic and character portrayals. Obverses that the Chinese women are portrayed as superior to the men.

DOYLE, PAUL A. "Pearl S. Buck's Short Stories: A Survey." *English Journal*, 55 (January 1966), 62-68. Some of Buck's early naratives such as "The First Wife," "The Angel," and "Enough for a Lifetime" are effective examples of old-fashioned, traditional story telling, but most of her short stories are too facile, improbable, and simplistic.

HARRIS, THEODORE F. *Pear S. Buck. A Biography*, New York: Day, 1969, 1971. These two volumes written "in consultation with Pearl S. Buck" are, along with her autobiography *My Several Worlds*, the main sources of necessary biographical data. Volume 2 consists entirely of a

selected number of her speeches, essays, and letters chosen to convey her philosophy.

HENCHOZ, AMI. "A Permanent Element in Pearl Buck's Novels. *English Studies*, 25 (August 1943), 97-103. A thoughtful article which analyzes Buck's use of conflict and contrast to develop the themes of pain, sacrifice, and innocent victims.

HOYLMAN, ALTA. "Pearl Buck's Own Good Earth." *Modern Maturity*, February-March 1978, pp. 50-51. Discusses Stulting place, the West Virginia family home where Buck was born. The homestead has been attractively restored and is maintained as a tourist attraction.

LANGLOIS, WALTER G. "*The Dream of the Red Chamber, the Good Earth*, and *Man's Fate:* Chronicles of Social Change in China." *Literature East and West*, 11 (March 1967), 1-10. *The Good Earth* is socially important because it describes the agricultural masses of the Middle. Kingdom during the years when outside forces began to impinge on this group.

LASK, THOMAS. "A Missionary Heritage." *New York Times*, March 7, 1973, p.40. Buck possessed an excellent awareness of and sympathy for, all aspects of humanity. She wanted a wide audience to hear her humanitarian messages, which were developed from her missionary upbringing. Other than *The Good Earth* and her biographics, her books are too "facile" and "slack."

LEE, HENRY. "Pearl S. Buck Spiritual Descendant of Tom Paine." *Saturday Review of Literature*, Dec. 5, 1942, 16-18. A report on the wartime activities of Pearl Buck, with emphasis on some of her various humanitarian endeavors.

LINDSEY. JASON. *A Study of Pearl S. Buck.* New York: Day, 1966. This was published as the second part of a pamphlet co-entitled *Essay on Myself* by Pearl S. Buck. Lindsey gives an excessively eulogistic commentary on her literary career, emphasizing the reasons why she deserves the Nobel Prize. He believes she is one of America's greatest writers.

"Notes on Current Books." *Virginia Quarterly Review*, Spring 1976, 59-60. Praises the variety of stories in the *East and West* collection. Stresses that Buck understands character complexities and has considerable sympathy for these complexities.

"Pearl Buck." *New York Times*, March 7, 1973, p. 42 . This editorial

praises Buck for her humanitarinasim and for conveying the rality of China to her raders. Her winning the Nobel Prize may be justified for the same reasons that Winston Churchill won the award. "It was a testament to the breadth of her vision and the greatness of her human spirit." The *Times* devoted considerable space to Buck's death and burial; see the obituary notice by Albin Kerbs, March 7, 1973, pp. 1,40, and also March 10, 1973, p.34.

SHIMIZU, MAMORU. "On Some Stylistic Features. Chiefly—Biblical, of *The Good Earth,*" *studies in English Literature* (Tokyo). English Number 1964, pp. 117-34. Demonstrates with numerous examples, how biblical style has deeply influenced *The Good Earth* and become an integral part of the novel.

SINHA, SIMITA. "The Novels of Pearl S. Buck A Study in Major Themes," Diss. Lucknow University, India, 1974. Buck's works treat significant subject matter and are often stylistically effective. Her emphasis on faith and optimism is valuable in a negative era, yet she lacks a deeply philosophic mind and a Camus-like intellect. Buck has a Victorian reserve in handling sexual material. Her novels of other countries do no help the reader to understand native people's special racial characteristics because she stresses common traits shared with all humankind.

SNOW, HELEN F. "Pearl S. Buck 1892-1973: An Island in Time," *New Republic*, March 24, 1973, 28-29. Deprecates Buck's writing as an untrue portrayal of Chinese life. Claims that Buck glorifies the upper classes and that *The Good Earth* was successful only because of its sexual element and effective merchandising by her publisher.

SPENCER, CORNELLA. *The Exile's Daughter, A biography of Pearl S. Buck.* New York: Coward-McCann, 1944. This biographical study was written by Pearl Buck's sister. though at times it puts too much emphasis on household, garden, and other marginal details, this work is very thorough on biographical facts about Pearl Beck's childhood, her life in China, and her Randolph-Macon College years. This very useful biography carries us to the World War II period. Contains no literary criticism except a little eulogizing here and there. Cornalia Spencer is a pseudonym for Grace S. Yaukey.

THOMPSON, DODY WESTON. "Pearl Buck," in *American Winners of the Nobel Literary Prize.* Ed. Warren G. French and Walter E. Kidd. Norman: University of Oklahoma Press, 1968, pp. 85-110. Interesting

survey of some of Buck's strengths and weaknesses. Feels that Buck's writing appeals to idealists, to students shose hopes and ideals have not yet been disillusioned by experience.

VAN DOREN, CARL. The American Novel 1789-1939.Rev. ed. New York: Macmillan, 1940, pp. 350-53. Praises the style and richness of *The Good Earth.*

VAN GELDER, ROBERT. *Writers and Writing*. New York: Scribner's 1946. Brief but informative revelation of some of Buck's writing habits.

WALSH, RICHARD J.A. *Biographical Sketch of Pearl S. Buck.* New York: Day, Reynal and Hitchcock, 1936. This is essentially the same essay found in Walsh's "Introduction" to *The First Wife and Other Stories;* however, the data has been expanded and a useful bibliography of Buck's early writing is included.

WOLF, S.J. "Pearl Buck Talks of Her Life in China." *China Weekly Review*, Sept 24, 1932, 145-46. Valuable in establishing the style influences on Pearl Buck's writing—the King James version of the Bible and the old Chinese sagas.

ZINN, LUCILLE S. "The Works of Pearl S. Buck: A Bibliography. *Bulletin of Bibliography*, 36 (October-December 1979), 194-208. Superseding the Brenni checklist, this is the most complete listing of primary and secondary material yet compiled. It is a superlative work of research. Lucille Zinic associated with the Pearl S. Buck Birthplace Foundation, inc., which operates Buck's ancestral home in West Virginia as a museum and owns most of Buck's manuscripts.

وجودیت پسند امریکی ناول نگار

سالبیلو

سالبیلو یہودی لکھاریوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جسے اپنے آباو (بلکہ اپنے بعض ہم عصر اور ہم سرکئی دیگر یدش ادیبوں) کی طرح مشرقی یورپ کے عقوبت خانوں کے عذاب، معاشرتی بدحالی، بھوک، مفلسی، بے روزگاری، کسمپرسی اور سیاسی زوال کے طویل ادوار سے نہیں گزرنا پڑا، جس نے اس قوم میں من الحیثیت المجموع یاسیت، دکھ، کرب، منتقم مزاجی اور مذہب سے گہری وابستگی کو جنم دیا اور جس کے سبب ان کے تحریروں کا سارا پس منظر، پیش منظر اور رواں منظر نامہ مذہب، مذہبی اسطور، دیومالا اور لوک ورثہ کے عناصر ترکیبی کا مرہون منت بن کر رہ گیا۔ اس کے باوجود کہ سالبیلو مشرقی یورپ کے ان حالات میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ جہاں بچہ اپنے اوائل ہی میں لاوطنیت اور لامکانی کی شدت لے کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ مگر سالبیلو یہودیوں کے اس گروہ کی توسیع ہونے کے ناطے جو بے شمار مرحلوں سے گزر کر مہاجرت کے عذاب سے گزرا تھا، مذہبی طور پر پوری توانائیوں کے ساتھ تاریخی عمل سے وابستہ ہے۔ گو اس کا انداز نظر اور فکری زاویے قدرے مختلف ہیں، تاہم جزوی طور پر یہودی وجدان اور احساس محرومی کو اپنا موضوع بنا کر وہ یہودیوں کے اسی قبیل میں بھی آ کھڑا

ہوتا ہے۔ جس نے دنیا کی دانش میں صیہونیت کی بقا میں مرکزی کردار ادا کیا۔

سالبیلو کے والدین مشرقی یورپ کے اس یہودی سلسلہ فکر سے صدیوں سے وابستہ تھے جو انساب عالم میں "یہودی قوم کی برتری" سے عبارت ہے۔ اور جس کے سبب اسے مسلسل اذیتوں اور عذابوں سے گزرنا پڑا۔ مگر عجیب بات ہے کہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی زوال اور لا وطنیت نے جہاں ایک طرف انہیں پسماندگی میں مبتلا رکھا، وہیں دوسری طرف سکالری۔ انہوں نے دنیا پر اپنی برتری ثابت کرنے کی کسی کوشش کو رائیگاں نہیں کیا۔ بلکہ ۱۹۶۴ء تک دنیا میں نوبیل انعام کے لئے منتخب ہونے والے امیدواروں میں ۴۰ نوبیل پرائز ونر یہودی تھے اور ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا، جن میں ایک نام سالبیلو کا بھی ہے۔

سالبیلو کے والد ابراہام بیلو روس میں آباد تھے[۱]، جہاں وہ اور ان کی بیوی لیزا گورڈن روس کے لئے مصر سے پیاز درآمد کرنے کا کاروبار کیا کرتے تھے[۲]۔ مگر اس صدی کے اوائل میں ابراہام اس بڑائی میں مجسرت کی لہر میں سینٹ پیٹرزبرگ (اب لینن گراڈ) سے نقل مکانی کرکے ۱۹۱۳ء میں کیوبک (کینیڈا) میں آکر آباد ہوئے اور یہیں ۱۰ر جولائی ۱۹۱۵ء، میں سالبیلو پیدا ہوا۔ اس کے دو بڑے بھائی ایم بی بیلو، سیموئیل بیلو اور ایک بڑی بہن مسز چارلس کف مین تھیں۔

سالبیلو اور اس کا خاندان ان دنوں مونٹریل کی ایک غریب اور پرانی بستی میں رہتے تھے، جہاں زندگی آسودگی کے نام سے ناآشنا تھی۔ سات سال کی عمر میں بیلو کو مختلف زبانیں سیکھنے کے لئے سکول میں داخل کیا گیا، جہاں وہ چار زبانوں انگریزی، پولش، عبرانی اور فرانسیسی پڑھ رہا تھا۔ عبرانی اس کے مذہبی عقیدے کی زبان تھی، جس میں یہودی لوک ورثہ، اساطیر اور دیو مالا کا خزانہ چھپا ہوا تھا مگر انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے مستقبل کی ضمانت چھپی ہوئی تھی۔

ابھی بیلو ۹ برس کا تھا کہ ۱۹۲۴ء میں اس کے والد ابراہام بیلو اور لیزا گورڈون نے کینیڈا چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ غربت اور مفلسی سے نجات کے لئے امریکہ کی سرزمین شکاگو ان کا انتظار کر رہی تھی۔ سالبیلو کے لئے یہ نقل مکانی روشن مستقبل کے کئی امکانات لے کر طلوع ہوئی۔ اول اوّل میں اس نے شکاگو میں لائبریریوں سے کسب فیض سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا یہاں کی زندگی سفید اور سیاہ کے تضادات سے عبارت تھی۔ سالبیلو کہتا ہے" اسے شکاگو میں گزارے ہوئے بچپن کے بہت کم واقعات یاد رہ گئے ہیں سوائے اس کے کہ میں خالص مذہبی ماحول میں پروان چڑھ رہا تھا اور اپنے آپ کو انڈین یہودی تصور کرتا تھا۔"
اسی دوران اسے TULLY HIGH SCHOOL میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں اسے ایک طرف مذہب کی گہری گرفت اور دوسری طرف جدید زندگی کے تضادات کے درمیان کھڑا ہونا پڑا۔ ایک طرف اس کا ماضی اپنی مضبوط روایات اور" انسانی برتری" کے احساس کے ساتھ موجود تھا، تو دوسری طرف نیا ثقافتی لینڈ سکیپ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اگر ایک طرف اس کا مذہب اور لوک ورثہ اپنے پورے تہذیبی ثروت کے ساتھ اس کے لاشعور کو آباد کر دیا گیا تھا، تو دوسری طرف ایک نئی ٹھوس زمین اس کے پیروں کے نیچے موجود تھی۔ اس تضاد نے اس کے ذہن میں کشمکش کی ایک نئی رد اتان دی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں اس سکول سے گریجویشن کرنے کے بعد جب وہ شکاگو یونیورسٹی میں پہنچا تو اس کے سوچ سمندر نے اسے ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ جہاں نئے علوم کی چکا چوند اور پرانے تہذیبی رویوں نے نئے انداز سے سوچنے کے عمل کا آغاز کیا۔ اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں نے اور ایک مسلسل اضطراب نے اس کے اندر گھر کر لیا۔ یہی اضطراب آگے چل کر اس کے نظریۂ فن کی بنیاد بن گیا۔
۱۹۳۵ء میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر رابرٹ ایچ ہوشنز نے RETURN TO THE CLASSIC پروگرام شروع کیا، تو سالبیلو نے" ثقافتی سرمائے کو سمجھنے کے لئے دیونیورسٹی

کے ماحول کو) جامد نفضا قرار دیا۔[۵] جس کے سبب اسے یونیورسٹی چھوڑنا پڑی اور وہ نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں اس کی ملاقات بشریات کے معروف استاد میلول ژاں ہارسں کوائسں سے ہوئی۔ اس نے بشریات کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کردی اور ۱۹۳۷ء میں بی ایس سی کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس کا یہ اعزاز اسے اس کے مقالے" بشریات اور معاشرہ" پر ملا۔

۱۹۳۷ء میں کامیابی کے نتیجے میں اسے سکالرشپ ملا تو اس نے وزکونسن یونیورسٹی میں MADISON میں داخلہ لے لیا۔ اس کے اساتذہ کو یقین تھا کہ سالبیلو بشریات میں غیر معمولی کام کرکے دکھائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور جلد ہی اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا اور جب کرسمس کی چھٹیاں ہوئیں تو سالبیلو اس کے بعد کبھی واپس یونیورسٹی نہ آیا۔" مجھے ہر وقت اپنے تھیسس پر کام کرنا پڑتا تھا اور ہر وقت کہانیاں تلاش کرنی پڑتیں۔ میں کرسمس کی چھٹیوں میں یونیورسٹی سے غائب ہوا اور کبھی نہیں لوٹا۔"[۶]

سالبیلو نے یونیورسٹی سے غائب ہونے کی جو داستان بیان کی ہے وہ اس کے یونیورسٹی جانے سے روکنے کا سبب نہیں تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران اس کی ملاقات ایک سماجی کارکن انیتا گوشکن سے ہوئی[۷] اور یہ ملاقات قربت سے ہوتی ہوئی ۱۹۳۷ء میں ہی شادی پر ختم ہوئی۔

سالبیلو کے یونیورسٹی چھوڑنے کے پیچھے اس کے ذہن میں پروان چڑھنے والا ایک اور خیال بھی تھا۔ اس دوران اس کی دلچسپی ادب سے ہوئی اور وہ ادب کے اس قدر قریب چلا گیا کہ اسے بشریات کا موضوع بے کار نظر آنے لگا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک ادیب کی حیثیت سے کرے گا اور ساری زندگی ادب سے رشتہ قائم رکھے گا۔ ان وجوہات نے اسے یونیورسٹی میں مصروف رہنے کو بیکار ثابت کیا اور سالبیلو بشریات میں سپیشلائزیشن نہ کر سکا تاہم ادب کے بحر بے کنار کا شناور بن گیا۔

۱۹۲۸ء میں اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ورکس پراگس ایڈمنسٹریشن منصوبے "وجوہ اضمحلال" پروگرام میں ملازم ہو گیا۔ اس میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کئی وسطی مشرق کے ادیبوں کے شخص و عکس پر مضامین لکھے مگر وہ زیادہ دیر یہاں نہ ٹھہر سکا اور شکاگو کے پیسٹالوزی فروبل ٹیچرز کالج میں تدریس کے پیشے میں داخل ہوا اور چار سال تک پڑھاتا رہا۔ اسی دوران ۱۹۴۱ء میں اس نے کہانی لکھنے کا آغاز کیا اور اس کی پہلی کہانی TWO MORNING MONOLOGUE شائع ہوئی۔
۱۹۴۲ء میں وہ دنیا کے بہت بڑے معلوماتی ادارے برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے ادارتی شعبے کے رکن کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ یہاں سے اس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔ اپنے فرائض منصبی کے حوالے سے بڑے لوگوں کی زندگی کے مطالعے کا موقع ملا اور اس کے نظریات نمو پانے لگے۔ اس نے ماضی، حال اور مستقبل کو اپنی زندگی کے تجربات سے سمجھنے کی کوشش کی۔ انسان، اس کی حیثیت اور بے توقیری نے اس کے نمو پاتے نظریات کو متشکل کرنا شروع کیا۔ اسی دوران جب دوسری جنگ عظیم کی آگ نے دنیا کی بیشتر آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، کچھ عرصہ کے لئے سا لبیلو مرچنٹ نیوی میں ملازم ہوا، غالباً اسی دور میں اسے اپنے پہلے ناول "جھولتا انسان" DANGLINGMAN کو مکمل کرنے کا موقع ملا۔ ڈینگلنگ مین کو سالبیلو کے نظریاتی سفر کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ جہاں پہلی بار مغائرت ALIGANTION کا سوال اُبھر کر سالبیلو کے فکری سلسلے کو وجودیت اور پھر نو وجودیت کے علاقے تک پہنچا دیتا ہے۔
ڈینگلنگ مین کا ہیرو جوزف "مغائرت اور تنہا فرد" کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس کہانی کا لینڈ سکیپ دوسری جنگ عظیم میں شکاگو کی سرزمین سے ابھرا اٹھتا اور سالبیلو کے فکری منظرنامے کی تکمیل کرتا ہے۔ گو یہ مسائل نئے تھے نہ کہانی میں موجود فلسفہ مگر کہانی کے تانے بانے اس طرح مرتب و مربوط تھے کہ کہانی ایک فرد کے گرد گھومتی ہوئی پورے دور کی مجموعی

بے حسی اور مغائرت کی کہانی بن جاتی ہے۔

جوزف جو اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے آزادی کے لئے اپنے گھر، دوستوں، عزیزوں اور معاشرے سے قطع تعلق کر لیتا ہے، اصلاً بیلو کے نزدیک " آزادی کے نہایت محدود علائق " میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کیا بیلو جوزف کی آزادی کو طنزاً معاشر کے سامنے پیش کرتا ہے یا اس کے ذہن میں سارتر کی اس وسیع تر آزادی کے نظریے کی محدود تصویر ہے۔ جس میں آزادی ہی تمام اقدار کی معنویت کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ آزادی معاشر میں موجود تمام مروج اخلاقی قدروں کو جنم دے کے خود آزادی بن جاتی ہے۔ دراصل سارتر انسان کو ایک ایسی نیستی NEHLISN میں دیکھتا ہے جو کسی مثبت ذات کی تلاش میں ہو۔ فرد اشیاء کی طرح مکمل ہستی نہیں لیکن اسے ایک مکمل ذات کا درک حاصل ہے اور یہی ادراک اس کے نئے اضطراب کا سبب بنتا ہے۔ تاہم جوزف کا کردار نیستی کی حدود سے باہر نہیں نکلتا اور آزادی کے وسیع تر تصور کو محدودیت میں قید کر دیتا ہے۔ شاید ۱۹۴۴ء اور جنگ کی تباہ کاریوں نے امریکہ پر جس طرح اثرات مرتسم کیے تھے۔ نئی نسل کا فطری ردِ عمل اسی طرح ظاہر ہوا ہو! ممتاز نقاد ایڈمنڈ ولسن اس ناول کی تعریف کرتے ہوئے ناول کو

" جنگ اور ڈپریشن کے عہد میں پروان چڑھنے والی نوجوان نسل کی نفسیات پر نہایت دیانتدارانہ اور معتبر شہادت " [9]

قرار دیتا ہے مگر آزادی کے جس تصور کو وہ وجودیت سے وابستہ کر کے پیش کرتا ہے وہ سارتر کے نظریہ وجودیت پر اپنی بنیادیں استوار کرتا نظر آتا ہے وہ فکری طور پر کیرکے گارڈ کے زیادہ قریب ہے۔ مارکس فلسفے کو انسانی نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفہ، آفاقی، ماورائی اور مابعد الطبیعاتی اقدار سے بحث نہیں کرتا۔ وہ معاشرہ میں فرد کی ذات کو سنگین خطرات کو فلسفے کا موضوع قرار دیتا ہے۔ جبکہ اکثر وجودی مفکرین وجودیت کو فلسفہ قرار دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور اسے ایک فکر یا تحریک

قرار دے کر عدم پر وجود کی تعمیر ہوتے دکھاتے ہیں۔ اس حوالے سے جوزف جو اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے قطع تعلق ہو کر "کلی آزادی" کے جن علائق میں خود کو محسوس کرتا ہے اسے خود اپنی ذات سے بے معنویت میں اترتی اور گم ہوتی نظر آتی ہے۔ جوزف ذات کی گمشدگی کے نقصان کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہاں سالبیلو باور کرانا چاہتا ہے کہ جوزف کے وجود کے معانی اس کی آزادی کے تجربات ہیں بلکہ اس طرح وہ اپنی ان مشکلات کو بھی کم کرنے کی طرف راغب ہے جو جنگ نے اس کے لئے بڑھا دی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ ناول جنگ نامہ نہیں اور نہ ہی جوزف کی آزادی یا جنم جنگ کی پیداوار ہے بلکہ یہ سالبیلو کے زمانی شعور کی ایک اہم دلیل ہے۔ کہانی ایک ڈیری فارم سے شروع ہوتی ہے جہاں وہ پراگندہ ذہنی، شدید کھنچاؤ اور کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہاں اس کے ذہن میں ان واقعات کی جھلکیاں ابھرتی ہیں جو کچھ پہلے رونما ہوتے تھے اور بیلو جوزف کے ذریعے ان مکالمات کو دہراتا ہے جو اس دن رونما ہوئے ہوتے ہیں، پھر زندگی کے بے شمار واقعات کے گرداب میں جوزف جھولنے لگتا ہے اور واقعات کا خاتمہ جس نئے ڈگمگاتے آدمی تک پہنچتا ہے۔ وقت کئی زقندیں بھر کر جنگ کے میدان تک آپہنچتا ہے اور یہیں سے وہ غیر معمولی واقعات کی شدت کی زد میں آکر اپنی داخلیت میں ڈوب کر نیستی اور وجودی موت کا شکار ہو کر مغائرت اور اضطراب کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے مگر مغائرت اور نیستی کے یہ تجربات بالآخر اسے اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتے ہیں کہ "آزادی کی مدد سے انسان اپنی ذات کو استحکام دے سکتا ہے"، "انفرادی آزادی یا ذاتی انصاف" محض خیالی انا کی بے معنی اصطلاحیں ہیں اور جب جوزف اپنے گرد قائم اس ہالے کو توڑ کر فوج میں بھرتی ہونے کی تیاری کرتا ہے تو اسے ایک سکون ملتا ہے اور وہ دوبارہ اپنی بیوی کے ساتھ پُرسکون زندگی کی طرف بڑھتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد وجودی فلسفے میں سالبیلو کے ہاں آزادی کا تصور بے معنی اور مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

سالبیلو کی ادبی زندگی کا آغاز جس پہلے ناول سے ہوا وہ آج کی فضا میں شاید بھرپور انداز میں معنی نہ دے سکے۔ مگر جنگ عظیم دوم کے دوران اور ناکنر اور ہیمنگوے جیسے بڑے ناول نگاروں کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لئے سالبیلو کی آمد کو اس وقت کے تنقید نگاروں نے "خوش کن تخلیق کار" کے نام سے یاد کیا تھا، جس کے پیچھے عصری شعور بھی تھا اور فن کی مضبوط گرفت بھی۔

سالبیلو کو اب لکھنے کا ایک وسیع میدان مل گیا تھا۔ اس کی تخلیقات مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ اسی دوران تین سال تک انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں کام کرنے کے بعد اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۴۶ء میں منی سوٹا یونیورسٹی میں انگریزی کی استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۷ء میں اس کا دوسرا ناول وکٹم VICTIM شائع ہوا جس نے ایک بار پھر سالبیلو کو ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا دیا۔

سالبیلو کے نئے ناول "وکٹم" اور پہلے "ڈینگلنگ مین" آباد دنیا اپنے رویے کے اعتبار سے پوری طرح ایک دوسرے سے مشابہ ہے۔ دونوں میں سالبیلو نے جزوی طور پر پیچیدہ فطری قوتوں کے شعور اور خود آگہی کے لئے بشری اصرار کے درمیان شکست و ریخت میں مبتلا ذات کے المیے کی طرف بڑھنے والی کی توجہ مبذول کی ہے۔ ان دونوں ناولوں کے موضوع THE ME کے مطالعے سے جو بات مشترکہ مظہر ہے وہ فلسفہ سرحد DETERMINISTIC LIMIT ہے۔ ڈینگلنگ مین کے جوزف اور وکٹم کے عیسیٰ ASA کے کرداروں میں اور بھی بہت سی مشابہتیں ہیں۔ ایک طرح سے دونوں اینٹی ہیرو ہیں، دونوں بیگانگی اور مغائرت کا شکار۔ دونوں وقت کے زوال منظر نامے میں مقید اور بے حرکت نظر آتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے فہم و ادراک کے خوف کے

ساتھ زندہ ہیں۔ جوزف اور عیسیٰ اصلاً دونوں میں سالبیلو ہی مظلوم (وکٹم) اور دونوں ہی ڈگمگاتا انسان ہے۔ تاہم دونوں میں سالبیلو کے انسان کے بارے میں تصور جدا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے اس پہلے افسانے TWO MORNING MONOLOGUE میں فکری دروبست زیادہ وضاحت کے ساتھ نمایاں ہے جہاں وہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ممکن ہے انسان کے دکھ اور تکالیف معاشرے کی بے ترتیبی کے سبب ہوں اور یہیں سے ایک معاشرتی انسان کی "دوسرے پر ذمہ داری" کا نظریہ اس کے نزدیک زیادہ وضاحت کا طلبگار ہے۔

سالبیلو کی دونوں تخلیقات کے مابین زمانی وقفہ سالبیلو کے نظریے کی جائزہ کاری کا وقفہ بھی ہے۔ اس عرصہ میں جہاں ایک طرف وجودی نظریہ وفکر راسخ ہوتے ہیں، وہیں عملی تجربات کرداروں کی تشکیل اور DEVELOPMENT میں نئی جہتوں کا تعین بھی تیقن حاصل کرتا نظر آتا ہے، تجربوں کی نیابت میں جہاں پہلے اور دوسرے ناول میں شباہتوں کے کئی زاویے سامنے آتے ہیں وہاں قابلِ ذکر اَتّق اس کے دوسرے ناول میں نئے پہلو ابھارتا ہے اور سالبیلو کا نظریہ جزوی ملکوتی انسان کی جگہ پاتا دکھائی دیتا ہے۔ "ڈینگلنگ مین" جہاں آزادی کے مفہوم کا تجزیہ کرتا ہے وہیں وکٹم میں ایک دوسری انسانی کیفیت بارجرم اور ذمہ داری کی سوچ میں نظر آتا ہے جو زیادہ اُلجھے ہوئے مگر غیر مبہم اور ٹھوس شکل میں جلد حل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جوزف اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور آزادی کو برقرار رکھے یا اسے ترک کرکے سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے آگے بڑھے اور وہ دوسرا راستہ یعنی اجتماعیت کو انتخاب کرتا ہے۔ مگر عیسیٰ کے پاس انتخاب نہیں ہے اور اس کے لئے واپسی ناممکن ہے۔ وہ اس صورتِ حال کو ترک نہیں کرسکتا، اسے اس صورتِ حال میں اپنے لئے امکانات پیدا کرنے ہیں۔

کہ یہ ساری صورتِ حال اس کے قابو سے باہر ہے، اس کے اندر بے شمار خوف پلتے ہیں، جنسی روابط بھی ایک ہولناک خوف بن کر اس کے اندر موجود ہے جس کے اشارے ایلینیا کے ساتھ اس کے رویے سے مترشح ہیں۔ اسے اس بات کا احساس نہیں کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے، مگر اس کا احساسِ جرم اس رغبت سے پھوٹتا ہے جو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں پیدا ہوتا ہے۔

وکٹم کی کہانی دو سطحوں پر سفر کرتی ہے، پہلی وجودیت پسند کی فرد ہے اور دوسری سطح کہانی کو پورے معاشرے پر منطق کر دیتی ہے۔ اسے بنیادی طور پر رومانیت کا ناول بھی قرار دیا گیا ہے جو سالبیلو کے حوالے سے نئی فکری جہتوں کا پتہ دیتا ہے۔ مارکوس کیلین کے بقول یہ ناول شہری زندگی میں اپنے ذات کے تحفظ اور معاشرے کے مابین تصادم پر استوار ہے جو انفرادیت وجود کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔

۱۹۴۸ء میں اسے GAGGENHIEM ایوارڈ ملا۔ جس کے نتیجے میں اسے پیرس اور روم کی سیر اور امریکہ سے باہر نئی زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ سفر کے اسی دورانیے میں اس نے اپنا ایک ناول لکھنا شروع کیا اور THE ADVENTURE OF EUGIE کے نام سے مکمل کیا، جو MARCH VIKING PRESS نیویارک سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔

سالبیلو کا یہ ناول کو فکری اعتبار سے پہلو سے مختلف نہیں تھا، مگر موضوع کے لحاظ سے ایک نسلی امتیازی نیابت کرتا ہے اس ناول میں سالبیلو نے شکاگو کے یہودیوں کی زندگی کو ہدف بنا کر ان کے اس تصور لامکانیت پر قلم اٹھایا جو یہودیوں کے بنیادی کرب کی دلالت کرتا ہے، واحد متکلم (بیانیہ) انداز میں لکھا جانے والا یہ ناول سالبیلو کے نزدیک امریکی ناول کو ایک نئی جہت دینے کی ایک کوشش تھا، اپنے شور انگیز

مزاج کے اعتبار سے اس ناول کے کردار EUGIE اور اس کے پہلے کرداروں کے مابین ایک فرق بڑا واضح ہے کہ اس ناول کے کردار امکانات اور امید کو کسی لمحے بھی ترک کرتے نظر نہیں آتے۔ یہ کردار بھی معاشرتی زبردستی کے کرب میں مبتلا ہے۔ دنیا کی خرابیاں اور جبر و تشدد ان پر عیاں بھی ہے لیکن وہ فطرتاً اپنے آپ کو معاشرے سے الگ یا مشکوک نہ کرنے پر مجبور ہے۔ ہینڈرسن پانی کو ناپاک کرنے کے مسئلے پر بغیر کسی دعوت یا بلاوے کے رضاکارانہ طور پر مدد کے لئے جاتا ہے اور لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے ذہنی رویوں کو رد کرتا ہے جو اس کے نزدیک ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہتا ہے[۱۱]

"تم ہر وقت بڑے موتیف تلاش کر سکتے ہو۔ یہاں ہر وقت بڑے موتیف بکھرے ہوتے ہیں۔ بہرحال میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہ قبول نہیں ہیں۔"[۱۲]

اوپر کے اقتباس میں ہینڈرسن ایک مقامی کردار کے ساتھ سامنے آتا ہے مگر سالبیلو کے دوسرے کرداروں کی طرح اس کردار میں مشابہت یا عینیت پرستی کے اثرات نمایاں ہیں جو ان کے کردار کے مختلف ادوار میں نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

EUGIE یتیم بچوں کے لئے ایک یتیم خانہ کھولنا چاہتی ہے۔ اور جب ہینڈرسن افریقہ سے واپس آتا ہے، تو ایک یتیم بچے کو اپنے ساتھ لاتا ہے، جسے وہ اپنانا چاہتے ہیں، مگر حادثے نہایت خاموشی کے ساتھ ان کے لئے شوریدگی اور پیچیدگی کا دروازہ کھولتے ہیں، مگر امکانات پر ان کی نظر ان مسائل کو کم کرنے میں مدد دیتی ہے، صداقت کی تلاش میں یوجی EUGIE اور ہینڈرسن ان اصطلاحات اور متعینہ زندگی کو جو انہیں ملی ہے اور متعینہ کردار پر عمل پیرا ہونے میں جو معاشرے کی طرف سے ان پر ٹھونسا گیا ہے، ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ان کا آزادی کی تلاش میں سوچ کے نئے در کھولنا ایک فطری عمل کے ساتھ سامنے آتا ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہر نیا ایڈونچر

ان پر زندگی کے نئے معنی اور امکانات کے راستے وا کرتا ہے ۔

سالبیلو کا تخلیقی سلسلہ اس کے ادبی اور فکری نظریات کی DEVELOPMENT کے مختلف مراحل کی طرف بڑھنے اور انسانی وجود کو کائنات میں مناسب جگہ دینے اور کائنات و ذات کو ایک ساتھ دیکھنے میں اس کے نظریے اور ایقان کی مدد کرتے ہیں ۔

بیسویں صدی جب اپنا نصف فاصلہ طے کر چکی ، جنگ کے اثرات کے نتائج میں دنیا بھر کی غلام بستیوں میں آزادی کی مانگ بڑھ گئی ، بے گھر یہودیوں کے لئے صیہونی سازشوں کے نتیجے میں فلسطین کی سرزمین پر ایک نیا ملک آباد ہوگیا ۔ یہودیوں کے لئے دو ہزار سال سے نامکانیت کا المیہ ایک نئے تصادم اور تضاد میں بدل گیا ، دنیا بھر کی سوچ میں ایک عہد آفریں تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے ۔ ٹھیک اسی وقت امریکہ کے اس نابغہ روزگار کہانی کار کی زندگی کا سفر بھی ایک نئے جہاں میں نئے امکانات کے ساتھ آگے بڑھنے لگا ۱۹۵۰ء میں سالبیلو نیو یارک یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہوا اور جب ۱۹۵۲ء میں اس نے نیو یارک یونیورسٹی سے رابطہ توڑا تو پرنسٹن یونیورسٹی میں تخلیقی ادب کا استاد بن کر آنے والی نسل کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے لگا ۔ اسی سال اسے ادبی دنیا میں ایک اور کامیابی حاصل ہوئی اور اسے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز کی طرف سے ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا ۔

۱۹۵۳ء میں سالبیلو نے پرنسٹن یونیورسٹی سے کنارا کیا اور بارڈ کالج نیو یارک میں فیکلٹی رکن کی حیثیت سے نئی دنیا آباد کرنے لگا ۔ اسی سال THE ADVENTURE OF AUGIE MARCH کو سال کا نہایت اعلیٰ ادبی شاہکار قرار دے کر اس ناول پر اسے نیشنل بک ایوارڈ ملا ۔ جس سے اس کی ادبی زندگی کو مہمیز لگی اور وہ ادبی حلقوں میں بڑے لکھاریوں کی صف میں آگیا ۔

سالبیلو بارڈ کالج میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور ۱۹۵۴ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مینی سوٹا یونیورسٹی میں دوبارہ ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء میں اسے دوسری بار GAGGENHICNN فیلوشپ ایوارڈ ہوئی۔

اس وقت تک سالبیلو اپنی پہلی بیوی انیتا گوشکن سے علیحدگی اختیار کر چکا تھا چنانچہ اس نے اپنی زندگی کے ہمسفر کی تلاش شروع کی اور یکم جنوری ۱۹۵۶ء میں ایک خاتون الیگزینڈرا سے دوسری شادی کر لی جس سے بعد ازاں اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔

۱۹۵۶ء اس کی کامیابیوں کا سال تھا اس نے کئی اہم تخلیقی کام سرانجام دیئے اور کئی تخلیقات شائع ہوئیں، جن میں اس کا نیا ناول SIEZE THE DAY بھی شامل ہے، جسے اس کے ادبی کیریئر میں شاندار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ایڈونچر کے بیانیہ اور واحد متکلم انداز کے برعکس SIEZE THE DAY کی کہانی بالواسطہ تکنیک THIRD PERSON میں بیان ہوتی ہے۔ کہانی کے ہیرو اور دیگر کرداروں کے حواس اور رد عمل عکس کے ساتھ سامنے گھومتے ہیں۔ قصہ گو THIRD PERSON اور عکس REFLECTORS کو جس خوبصورت تکنیکی امتزاج میں سالبیلو نے پیش کیا ہے وہ سالبیلو کے فن پر اور کہانی بیان کرنے کے اسلوب اور تکنیک پر مکمل قدرت کا اظہار ہے۔ قصہ گو اور عاکس کے درمیان رابطہ کا حوالہ ناول کے آغاز ہی میں مل جاتا ہے۔ مگر کہانی گوئی کا یہ اسلوب مشکل بھی ہے اور نازک بھی۔ ذرا سی بھول نہ صرف کہانی کو تکنیکی اعتبار سے کمزور کر دیتی ہے بلکہ موضوعی لحاظ سے بھی اسے عجز میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جہاں سالبیلو فکری طور پر اپنی قوت اظہار کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے وہیں کہانی کے بیان میں وہ مختلف انداز اور تکنیک استعمال کر کے اپنی فنی گرفت کا پتہ بھی دیتا ہے "سیینر دی ڈے" کی کہانی کبھی مکالمے میں سفر کرتی ہے تو کبھی واقعات کا سہارا لے کر آگے بڑھتی

ہے۔ کبھی علامتوں میں اظہار کرتی ہے تو کبھی اپنے ہی انداز کی آواز بن جاتی ہے۔ کہانی کاری کا یہ انداز خاصا مشکل اور اسے پورے ناول میں برقرار رکھنا مشکل تر ہوتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت ناول کے آخر میں نظر آتی ہے جب ٹومی کی شعور ذات کی رو میں بڑبڑاہٹ THIRD PERSON کے کردار کے قریب چلی جاتی ہے۔ مگر بیلو کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں آوازوں میں فرق واضح کرتا ہے کسی فنکار کے لئے سب سے اہم مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ جس سے بیلو آسانی سے گزر جاتا ہے۔

"سیز دی ڈے" سالبیلو کے اس فکری کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جب وہ انسان کو اس ملکوتی صفات کے ساتھ دیکھتا ہے یا یہ کہ انسان کی توانائیوں کو تمام مشکلات پر قابو پالینے کی استعداد سے بھرپور قرار دیتا ہے۔ سالبیلو کے اس ناول یا ناولٹ کے کردار ٹومی وہلیم بھی ان ہی خصوصیات سے بہرہ ور ہے۔ اس میں بھی کچھ انسان جبلی خوف اور مثبت سمت میں مسائل حل کرنے کا ذرک ہے۔ وہ اس کے لئے غیر ہمدردانہ معاشرے سے تین سطحوں پر مصالحت کر لیتا ہے۔

الف : وہ اپنی ذات کی تلاش یا تلاش کے بارے میں سوچنے سے بھی گریز کرتا ہے
ب : وہ ایسی دنیا سے مصالحت کرتا ہے جو اس کے لئے کسی روحانی سمت کی رہنمائی نہیں کرتی۔
ج : اور خود اپنی ذات سے جو تاریک قوتوں کے سمندر میں ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح تیرتی رہتی ہے۔

سالبیلو کے اس ناولٹ کے یہی تین پہلو اس کے فکری دروبست کا اظہار ہیں۔ سالبیلو اس موضوع کو پوری طرح ابھارتا اور کمالِ فن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اصلاً وہ ذات کی رہنمائی اور غایت مغائرت کے الجھاوؤں سے بحث کرتا ہے اور ماہر مچھلی کے شکاری

کی طرح جو ایک بڑی مچھلی کو کانٹے میں پھانس لیتا ہے، نکر کے اس زاویے کو بار بار چھوڑتا اور استعمال کرتا ہے کیونکہ جس معاشرے میں کہانی ترتیب پاتی ہے وہاں "خدا ہی آخری قوت اور خالق ہے۔"

کہانی کا آغاز ٹومی کے شدید الجھاؤ سے اور دکھ کی کیفیت کے ساتھ شروع ہوتا ہے اس کی شدت اور بھرپور اظہار اولین صفحات پر ہی ہو جاتا ہے۔ جب ٹومی کے دن کا آغاز ہوتا ہے اور سارا کرب اس کے ایک جملے سے عیاں ہے۔

"AFTER BREAKFAST OUT-OUT-OUT-OUT THE GETTING OUT HAD IN ITSELF BECOME CHIEF BUSINESS"

اس جملے میں اکتاہٹ اور معمول کی زندگی سے بیزاری اپنی پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ پھر یہی کیفیت، زمانی تبدیلیوں میں بار بار سامنے آتی ہے۔

سالبیلو کے ادبی اور شخصی زندگی کا سفر اسی طور سطے ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس کا ایک اور قابلِ ذکر ناول HENDERSON THE RAIN KING شائع ہوا اور اسی سال اسے فورڈ فاؤنڈیشن ایوارڈ تین سال کے لئے گرانٹ ہوا[۱۴]۔ ۱۹۶۰ء میں فرینڈز آف لٹریچر فکشن ایوارڈ ملا[۱۵] اور اسی سال وہ ششماہی ادبی جریدے NOBLE SAVAGE کا شریک مدیر بن گیا۔ ۱۹۶۲ء تک وہ اس جریدے سے وابستہ رہا۔ اگلے سال اس نے اپنی دوسری بیوی انیتا سے بھی علیحدگی اختیار کی اور ایک ٹیچر سوسن گلاس مین[۱۶] سے شادی کر لی۔ اسی سال وہ PUESTO RICE یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر بن گیا۔ ۱۹۶۲ء اس کے لئے ایک بار پھر کامیابیوں کی نئی لہریں لایا۔ وہ یونیورسٹی میں باقاعدہ پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیا گیا۔ شکاگو یونیورسٹی میں "جدید ناول اور اس کے ہیرو" کے ایک سلسلہ تدریس سے بھی وابستہ ہوا۔ ادب میں اس کے بڑھتے ہوئے قد کاٹھ اور ناول کی دنیا میں اس کی مسلسل مقبولیت نے

اسے امریکہ کے ادبی افق پر اس طرح اجاگر کیا کہ لوگ ہیمنگوے اور فالکنر کی کمی کو بھول گئے۔
۱۹۶۲ء میں ہی اسے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی نے اس کی ادبی اور سکالری خدمات کے اعتراف کے طور پر اعزازی ڈگری ڈاکٹر آف لیٹر عطا کی۔
سال کے آواخر میں شکاگو یونیورسٹی نے ادب اور سائنس میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو عصری ادب سے مربوط کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس کا نام سماجی فکر SOCIAL THOUGHTS تھا۔ اس کمیٹی میں جن لوگوں کو یونیورسٹی کے اراکین کے طور پر شامل کیا ان میں ایک اہم نام سالبیلو کا بھی تھا۔ یہاں سے سالبیلو زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوا اور قومی سطح پر اس کا وجود تسلیم کر لیا گیا۔ ادبی سرگرمیوں کے علاوہ قومی فکر کے ہنگاموں میں بھرپور شرکت کرنے لگے۔ ۱۹۷۳ء میں ایک بار پھر اس کی ادبی خدمات پر اسے بارڈ کالج BARD COLLEGE نے ڈاکٹر آف لیٹر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۶۴ء اس کے لئے خاص خوش کن اور مصروف تھا۔ اس کا معرکۃ آلارا ناول HERZOG شائع ہوا۔ اسی سال اسے جیمس ایل ڈوو ایوارڈ، نیشنل بک ایوارڈ اور فومنٹر ایوارڈز ملے۔
۱۹۶۴ء اس کی ادبی زندگی کی ایک کامیابی ساتھ لایا تھا۔ اس کا ایک کھیل آخری تجزیہ THE LAST ANALYSIS براڈوے کی طرف سے ۲۹ ستمبر کو پیش کیا گیا اور یہ اس قدر پسند کیا گیا کہ لوگوں کے اصرار پر انتظامیہ اسے ۲۸ بار پیش کرنے پر مجبور ہو گئی۔
ہرزوگ HERZOG پہلا ایسا ناول ہے جس میں سالبیلو کا نظریہ فن اور فن دونوں تکمیل پاتے نظر آتے ہیں۔ یوں بھی یہ پہلا ناول ہے جس نے امریکی ناول کی تاریخ کو ایک قدم آگے بڑھایا۔
"ہرزوگ" اسلوب کے اعتبار سے رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج ہے

اپنے پہلے تینوں ناولوں کی طرح سالبیلو اس ناول میں بھی اس کا مرکزی کردار صعوبتوں کی باڑھ میں بند حالات اور اعصابی تھکن کے رویے میں نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف مایوسی کی بجائے اس کے سامنے بگی BUGIE اور ہینڈرسن کی طرح امکانات کا بے پایاں اور بسیط جہان آباد ہے۔

سالبیلو کے دوسرے ناولوں کے برعکس جن کے "شہر" ظاہری زندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اسی دنیا میں آباد ہیں، اس ناول کا شہر ہرزوگ کے اندر آباد ہے۔ ناول میں موجود ساری بستی اس کے اندر بستی ہے۔ موسیٰ ہرزوگ۔ خود کو "ادراک کا قیدی" کہتا ہے۔ مگر اس کا سارا عمل اس کی نفی کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ادراک "خود اس کا قیدی" ہے۔ وہ ذہن کچھ دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے اور قاری کو وہی کچھ دکھاتا ہے جو وہ خود دیکھتا ہے۔ ادراک اس کے تابع ہے۔

ہرزوگ ایک نفسیاتی دنیا کی کہانی ہے جہاں چیزیں باہر کم اور اندر زیادہ متحرک ہیں۔ سالبیلو نے اس صورتِ حال سے دوہرا کام لیا ہے۔ یعنی باہر کی کربناک فضا کو ذات میں جذب کرکے، ذات کو دنیا بنا کر پیش کیا ہے وہ معاشرے میں نظر آنے والے عناصر کا پرتو ہے اس ساری صورتِ حال کو کربناک طنز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک باشعور فرد کے اندر کا طنز۔ اس ناول میں حریص، خود پسند، متعصب، خبطی، نودولتیے، جوشیلے اور ہر قسم کی پیشہ ورانہ نااہل لوگوں سے یہ جہان بسا ہوا ہے۔ سالبیلو قوتِ اظہار کے زور پر اپنے عالمانہ اور تجزیہ عمل سے موضوع کی تشکیل کرتا ہے۔ سماجی برائیوں سے لبریز اس ساری فضا کو لفظیات کے سیلاب میں بہائے جانا چاہتا ہے۔ ناول کا سارا ماحول معاشرے پر ایک گہرا طنز ہے اور اس طنز کا پہلا شکار خود ہرزوگ بنتا ہے۔

سالبیلو کے تمام ناولوں کی فضا پر مغائرت اور بیگانگی کا غلبہ ہے اور اس کے اکثر ہیرو

اس فضا سے نکل کر زندہ بستی دنیا میں لوٹ جانے کی بالآخر کوشش کرتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر مغلوب اور ملول کردار اپنے طور پر اپنی قوتِ متخیلہ کے زور پر دفاعِ ذات اور انسانی خوبصورتی اور وقار کے تحفظ کے لئے AFFIRMATION کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا کردار سامنے آتا اور اپنی مثالیت پسندانہ طرزِ عمل IDEALISM کو حقیقت پسندی قرار دے کر مثالی معاشرے کی تعمیر کرتے اور خود کو (حقیقی) صداقت پر مسلط کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس طرح سالبیلو ذات کو اخوت میں تحلیل تو کر لیتا ہے مگر تحفظِ ذات اور انسانی مستقبل کے امکانات کو ٹھوس شکل دینے کی بجائے محض عقیدے کی نذر کرتے دکھائی دیتا ہے ہرزوگ بھی اس کیفیت کا شکار نظر آتا ہے۔

اس ساری صورتِ حال کے باوجود ہرزوگ پورے انسانی معاشرتی نظام کو اس کی شعور اور دانشورانہ سطح سے دیکھنے کی ایک کامیاب کوشش قرار پاتی ہے۔ سالبیلو نے تعمیری اور مذہبی تار و پود میں اپنے معاشرے اور معاشرتی افراد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو ہرزوگ کی شکستہ انانیت کے نظام کو بچانے کی ایک کوشش بھی ہے۔ ناول ہرزوگ کی گھریلو الجھنوں سے جس انداز میں بحث کرتا ہے وہ اس کی الجھی ہوئی سوچوں میں میڈی، اس کی مطلقہ بیوی، اس کے دوست اور بہت سی دیگر خواتین بھی در آتی ہیں جو ماضی میں اس کے قریب آئیں۔ اس کی پہلی بیوی ڈیزی، اس کی گرل فرینڈز وانڈا اور رمونا —— بار بار اس کی سوچوں سے ٹکراتی ہیں۔ خاص طور پر اس کے نظریات کے بارے میں سوچیں اس کا راستہ روکتی ہیں وہ اپنی ثقافت کے تباہ ہوتی اقدار کے بارے میں سوچتا ہے جو اصلاً اس کی اپنی بربادی پر دال ہے وہ سوچتا ہے کہ ان دونوں کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ وہ بظاہر "اچانک" اپنے ذہنی سکون کے لئے مختلف شہروں کا سفر کرنے کے بعد اپنے شہر میں پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کا بچپن گزرا تھا، جہاں اس کا ماضی دفن تھا۔ اسے گزرے زمانے کے بے شمار واقعات

قطار اندر قطار گھیر لیتے ہیں اور ساری فضا، خوف، شبہات اور خدشات میں لپیٹ جاتی ہے۔
ہرزوگ سالبیلو کا ایک ایسا ناول ہے جس پر تنقید نگاروں نے بے شمار لکھا ہے۔
اس کی بہت زیادہ تعریف بھی کی گئی اور اس کا اندازِ فکر تنقید کی زد میں بھی آیا۔ دوسرے
ناولوں کی طرح جہاں بیلو فردیت کے دفاع کے لئے نبرد آزما نظر آتا ہے اس ناول میں زیادہ
سرگرم ہے۔

"مسئلہ کیا ہے! ــــ مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کچھ لوگ ہیں، جو
بنی نوع انسان کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں، وہ بے وقوف، خود سر
اور گزیزی ہیں، انہیں ایسا کرنے سے روکنے کے لئے ان سے
منت کرنی چاہیئے۔"

ہرزوگ اپنے درج بالا خط میں ریڈیو ایکٹیویٹی کے بارے میں فلسفہ، خوف پر تنقید
کرتے ہوئے شدید جذباتی ہے اور جب وہ جوہری توانائی رکھنے والی قوتوں کے بارے میں
بات کرتا ہے تو نفی فنی نفیت NOHLISM کا مسئلہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے وہ انہیں
"دانشوروں کے تباہ کار، مایوسی کے مبلغ، انسانی روح کے منکر اور طاقتور قاتل قرار دیتا ہے"[ترجمہ]
اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد سالبیلو کا نقطۂ نظر اور فلسفۂ فن واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ والٹر
کلیمنز ہرزوگ کے حوالے سے مصنف کے بارے میں کہتے ہیں۔

BELOW SUPPOSED THAT THIS NOVEL ABOUT A MIDDLE-AGE

COCKOLD WHO COMPOSES UNMAILED LETTER TO EVERY

ONE FROM WILLIAM S[illegible]TTON TO SPINOZA MIGHT ENJOY A

NARROW CRITICAL SUCCESS AND SELL 8000 COPIES.

INSTEAD IT TOPPED THE BEST SELLER LIST FOR MONTHS [۲۴]

۱۹۶۵ء اس کے لئے گزشتہ کئی سالوں کی طرح مسلسل کامیابیوں کا سال ثابت ہوا۔ جس کے اثرات آنے والے سالوں پر بھی مرتب ہونے لگے۔ سال بیلو قومی منظر سے بین الاقوامی منظر نامے میں نظر آنے لگا۔ ۱۹۶۴ء میں اس کے ناول ہرزوگ نے انٹرنیشنل لٹریچر پرائز حاصل کر کے ایک بار پھر اس کی عظمت کو تسلیم کرایا۔ اس سال اس کی کتاب THE LAST ANALYSIS وائکنگ نیویارک کی طرف سے شائع ہوئی۔

اب سال بیلو باقاعدہ ڈرامے کی طرف بھی متوجہ تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس کے ایک ایکٹ کے تین ڈرامے UNDER THE WEATHER کے نام سے شائع ہوئے جو پہلے لندن میں اسی سال مئی میں پیش کئے گئے اور ناظرین سے بے پناہ داد طلب کی۔ اسی سال نومبر میں ایک ڈرامے کو نیویارک میں کھیلا گیا

سال بیلو کی شہرت امریکہ کی سرحدیں پہلے ہی عبور کر چکی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں جب پولینڈ میں ادیبوں کی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو سال بیلو اس کے شرکا میں سے ایک تھا۔ اس کا نفرنس کے سبب وہ کئی معروف ادیبوں سے ملا۔

۱۹۶۸ء میں شکاگو یونیورسٹی میں تنقیدی جدید رجحانات اور فکر کا جائزہ کار کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اسی سال اس کی نئی کتاب MOSBY'S MEMOIRS وائکنگ پریس کی طرف سے شائع ہوئی اور فرانس کا ایک ادبی ایوارڈ FRENCH CROCY DE CEVALIAR ARTS ملا اور اس طرح آنے والے سالوں میں اس پر ادبی انعام A LETTER کی بارش ہوتی رہی۔

سال بیلو کے نظریۂ فن پر گزشتہ صفحات میں اس کے کرداروں اور موضوع کے حوالے سے فرداً فرداً گفتگو ہو چکی ہے، جب کے فن کے مجموعی تاثر سے نظریۂ فن کی تلاش کی جاتی ہے تو سال بیلو فکشن کی دنیا کا ایک نہایت باشعور اور صاحب فکر معتبر تخلیق کار نظر آتا ہے

فن اور زندگی کے مابین رشتوں کو وہ افزمیشن کے ساتھ مربوط کرکے دیکھتا ہے۔ وہ ادب کو زندگی کا متبادل قرار نہیں دیتا۔ سالبیلو کے نزدیک زندگی اور زندگی کی صداقتیں نہایت پُراسرار اور سرکش ہیں، جو فنکاری دانشورانہ نظام سے بلند تر اور اپنے متعلق تمام تصورات سے متصادم ہیں۔ وہ فلسفے کی آنکھ سے زندگی کو دیکھنے کی نفی کرتے ہوئے کامیو کے نظریے آف دی لامکانیت کی تائید بھی نہیں کرتا اور نہ ہی فاکنر کا نستلجیا اس کے قریب قبولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ فلسفے کو زندگی کے دریچوں سے دیکھنے اور عقیدے کو فن کا حصّہ تصور کرتا ہے۔ اسی لئے وہ وجودی نظریے کا قائل ہونے کے باوجود سارتر سے زیادہ قریب نہیں بلکہ کیرکے گارڈ KIERKS GUARD کے نزدیک محسوس ہوتا ہے۔ سالبیلو نے اپنے نظریۂ فن کے پیچھے یہودی وجدان کو توانائی کے طور پر استعمال کیا ہے، مگر یہودیوں کی بے گھری کا المیہ اس کے ہاں اس طرح وجود نہیں پاتا جو اعلیٰ سطح پر نظر آئے بلکہ وہ اس نظریے کو عالمگیریت اور یہودی احساسِ محرومی کو کلیت عطا کرتا ہے[۲۲]۔ اس کا خیال ہے کہ عام انسانی زندگی ہی صداقت پر مبنی ہے۔ وہ ادب کی مرہونِ منت نہیں، وہ زندگی کو ادب کے لئے مختص خیال کرتا ہے[۲۳]۔ اسی لئے خود اس کے فن میں ادب اور زندگی دو دھاروں کی صورت میں نظر نہیں آتے، دونوں ایک دوسرے کے جزو لاینفک اور ایک دوسرے کی ضرورت اور وقار دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کردار کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے۔ اگر کوئی افہام و تفہیم کے ساتھ کرداروں کے ساتھ چلنا چاہے تب ہی وہ کردار کے اندرونی ذات اور نفسیات کا ادراک حاصل کر سکتا ہے[۲۴]۔ اس حوالے سے سالبیلو کے کردار زیادہ پیچیدہ اور اندرونِ ذات زندہ ہیں، ان کے قریب پہنچ کر ہی ان سے افہام و تفہیم ممکن ہے۔

سالبیلو فن اور زندگی کے مابین پُرمعانی تعلقات کی نوعیت پر یقین رکھتا ہے۔ نوبیل انعام حاصل کرتے ہوئے اس نے اپنی تقریر میں، خاص طور پر جن مسائل پر زور دیا وہ احساس

صداقت کے وجود سے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ادب کے ساتھ اور زندگی کے ساتھ ادیب کی کمٹمنٹ کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ ادیب جو کچھ کہتا ہے وہ صداقت اور کمٹمنٹ کے علائق کی نیابت میں کہہ رہا ہوتا ہے۔ وہ اس پر بھی یقین رکھتا ہے کہ صداقت اظہار ہی وہ حقیقی قوت ہے جو تخلیق کو توازن حسن اور بالیدگی عطا کرتی ہے اور ادیب کو خود غرضیوں سے روکتی ہے اور اس کے داخلی تصورات کو زندگی سے مربوط کرتی ہے، کسی ادیب کا کمال فن ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ متعینہ نظریات، ڈاگ ماز اور غیر تنقیدی رویوں کے تابع لفظیات اور جملوں کے سیلاب کی بجائے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاکر موضوع کی شدت کے مطابق کہانی کی بنت کاری کرے، سالبیلو اپنے ان خیالات نظریات پر قائم رہتا ہے اور ادب وزندگی کے مابین اجنبیت کے وجود سے انکاری ہے۔

سالبیلو اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ ادیب اپنے ادب کے ذریعے لاشعوری سطح پر انتہائی ذمہ داری سے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ مگر وہ جبراً اپنا اخلاقی نظریہ ادب میں داخل کرنے کی کوشش کرے گا، تو وہ محض ریاکاری ہوگا۔ نظریہ تو تخلیق کار کے اندر موجود ہوتا ہے، وہ زندگی کی حقیقتوں سے توانائی حاصل کرتا ہے، اور جب وہ لکھتا ہے تو خود بخود اس کے ادب میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں آکر وہ مذہبی اخلاقی نظریہ فن کے حوالے سے اپنے لیے وجودیت کا ایک نیا جہاں آباد کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سالبیلو کے نظریہ فن پر ایک شدید ملول اور یاسیت کی فضا چھائی ہوئی ملتی ہے، مگر وہ اس کو مترحم بنانے کی بجائے طنز کے ہتھیاروں سے کربناکی کی سلیں توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

سالبیلو کے فن میں ایک لہر اور بھی نظر آتی ہے جو یہودیوں کی بے گھری اور بے زمینی کے تصور سے لبریز ہے مگر سالبیلو یہودی کو" اللہ تعالیٰ کا منتخب انسان" تصور کرنے کے باوجود یہودیوں کی محرومی اور یاسیت کا سبب ذاتی ہوس سمجھتا ہے اور اس پر بحث کے لئے طنز کی زبان

استعمال کرتا ہے" کیونکہ یہ عہد طنز کا عہد ہے اور طنز کا رخ اور خطاب دوسروں سے نہیں خود اپنی ذات سے ہے[24]" اور اس طرح یہودی تاریخ و تجربے کو سالبیلو نے عصری ذہن و مزاج سے ہم کنار کر دیا۔

سالبیلو جنگ عظیم کے بعد ادب کے فلک الافلاک پر ابھرنے والا ایک نابغۂ روزگار ناول نگار ہے وہ جس یقین کے ساتھ سریت اور وجدان کی سمت بڑھتا ہے۔ کی مثال اس سے قبل کے ناول سے نہیں دی جا سکی۔

سالبیلو تحفظ ذات کے نظریے کا سرگرم ناول نگار ہے، مگر بار بار اخوت اور محبت کا دعویدار بن کر اپنے ایقان کی نفی بھی کرتا ہے۔ اس کا ادب مستقبل اور امکانات پر استوار ہے، مگر وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ انسان کی کوشش اور جدوجہد محدود ہے اور بعض متعینہ قوتیں اس کے اختیار سے باہر ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ اس کے ناولوں اور افسانوں کی فضا ایک انفعالی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے، مگر وہ ایک نہایت کٹر امید پرست بھی ہے۔

وہ جب ادب میں داخل ہوا تو اس وقت اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ ادیب امریکی ناول پر چھائے ہوئے تھے، مگر وہ کمال یقین کے ساتھ سامنے آیا اور اپنی تخلیقات کے سیلاب میں ساری شہرتیں بہاتا ہوا نصف صدی پر محیط ہو گیا۔

سالبیلو کے تازہ ناول HUMBOLDTS GIFT کا ہیرو جو ایک مورخ اور ڈرامہ نگار ہے جسے بے پناہ شہرت حاصل ہے کہتا ہے "شہرت حاصل کرنا خطرناک بجلی کی تاروں کو چھونا ہے جو عام آدمی کے لئے باعث ہلاکت ہوتا ہے۔ یہ زہر ہے، یہ سانپوں کو ہاتھوں سے پکڑنے کے مترادف ہے۔" سالبیلو کو شہرت سے نفرت ہے[25]" وہ شہرت کو فرد کی ہلاکت قرار دیتا ہے مگر اس کی زندگی میں اکتوبر ۱۹۷۷ء کا آخری ہفتہ اس کے لئے شہرت کا اتنا بڑا اعزاز

ے کر آیا جو سالبیلو کو تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر گیا۔

"سالبیلو نے (اپنی تخلیقات میں) ایک ایسے فرد کی تخلیق کی جو اپنی جہاں گردی کے دوران ڈگمگاتی ہوئی دنیا میں پیر جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے سے کبھی دستبردار ہونے پر تیار نہیں کہ "زندگی کی اقدار جہاں کی عظمت میں ہیں، کامیابیوں میں نہیں"۔

سویڈش اکادمی ادبیات کی طرف سے سالبیلو کو ۱۹۷۶ء کے ادبی نوبیل پرائز کا حقدار قرار دیتے ہوئے جب (درج بالا) تحسین پیش کیا تو اخبار نویسوں نے سالبیلو سے پوچھا "نوبیل انعام کی خبر سن کر آپ نے کیا محسوس کیا"۔ اس نے کہا:

"میرے اندر کا بچہ یہ خبر سن کر بہت خوش اور میرے اندر کا بالغ متشکک:

اور بوڑھا........"

ایک اخبار نے سوال کیا ـــــ سالبیلو نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور میز پر بکھرے ہوئے اپنے کاغذوں کو سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔
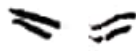
حوالہ جات

۱۔ ابراہام بیلو ABRAHAM BELLOW

۲۔ لیزا گورڈن LIZA GORDEN

۳۔ ٹوئنیتھ سنچری آرتھر سپلیمنٹ ۱۹۶۵ء 20TH CENTURY AUTHOR
SUPPLEMENT 1965
BY H. W. WILSON COMPANY, NEW YORK

۴۔ ایضاً

۵۔ کرنٹ بائیوگرافی ۶۵ CURRENT BIOGRAPHY 65

۶۔ ایضاً

۷۔ انیتا گوشکن ANILIN COSHKAN

۸۔ PESTALOZZI FROEBLE TEACHER COLLEGE

۹۔ ایڈمنڈ ولسن جریدہ ٹائمز نیویارک شمارہ ۳۴ مئی ۱۹۶۴ء صفحہ ۴۴

۱۰۔ منی سوٹا یونیورسٹی MINISOTA

۱۱۔ موتیف MOTIF

۱۲۔ دی ایڈونچر آف یوگی مارچ
THE ADVENTURE OF EUGLI MARCH

۱۳۔ پرنسٹن یونیورسٹی PRINCETON UNIVERSITY

۱۴۔ فورڈ فاؤنڈیشن ایوارڈ FORD FOUNDATION AWARD

۱۵۔ FRIENDS OF LITERATURE FICTION AWARD

۱۶۔ سوسن گلاس مین SUSAN GLASSMAN

۱۷۔ جیمس ایل ڈوو ایوارڈ JAMES L. DOW AWARD

۱۸۔ فومنٹر ایوارڈ FOMENTOR AWARD

۱۹۔ براڈوے تھیٹر نیویارک BROADWAY THEATRE NEW YORK

۲۰۔ جان جے کلے ٹن JOHN J. CLAYTON

"SAUL BELLOW - IN DEFENCE OF MAN"

INDIANA UNIVERSITY PRESS 1967 P 188

۲۱۔ بحوالہ ایضاً

۲۲۔ احمد سہیل" موت آگہی ہے" الفاظ گیا بھارت اگست ۸۲، صفحہ ۷۵

۲۳۔ سالبیلو بحوالہ" سالبیلو" از رابرٹ آر ڈوٹن

ROBERT A. DUTTON

TWAYNE PUBLISHERS

BOSTON 1978

۲۴۔ احمد سہیل صفحہ ۷۵

۲۵۔ "سالبیلو" نیوز ویک یکم نومبر ۷۶، صفحہ ۵۲۔

Salbilo

Bibliography

Fiction

Dangling Man. New York: Vanguard, 1944.
The Victim. New York: Vanguard, 1947.
The Adventures of Augie March. New York: Viking Press, 1953.
Seize the Day. New York: Viking Press, 1956.
Henderson the Rain King, New York: Viking Press, 1959.
Herzog. New York: Viking Press, 1964.
The Last Analysis (play). New York: Viking Press, 1965.
Mosby's Memoirs and Other Stories. New York: Viking Press, 1968.
Mr. Sammler's Planet. New York: Viking Press, 1970.
Humboldt's Gift. New York: Viking Press, 1975.
To Jerusalem and Back. Harmondsworth: Penguin Books, 1977.

Short Fiction

1941 "Two Morning Monologues," *Partisan Review*, 8 (May-June, 1941), 230-36.
1942 "The Mexican Genral," *Partisan Review*, 9-May-June, 1942, 178-94.
1949 "Sermon by Doctor Pep," *Partisan Review*, 16 (May 1949), 455-62.
"Dora," *Harper's Bazaar*, 83 (November 1949), 118,188-90, 198-99.1950
"Trip to Galena," *Partisan Review*, 17 (November-December 1950), 779-94.
1951 "Looking for Mr. Green," *Commentary*, 17 (March 1951), 251-61."By the Rock Wall," *Harper's Bazaar*, 85 (April 1951), 135,205,207-8,214-16.
"Address by Gooley MacDowell to the Hasbeens Club of Chicago," *Hudson Review*, 4(Summer 1951), 222-27.
"The Coblins," *Sewanee Review*, 59 (Autumn 1951), 635-53.
1954 "The Wrecker" (play), *New World Writing*, 6(1954), 261-87.
1955 "A Father-to-Be," *The New Yorker*, 30 (February 5, 1955).
1956 "The Gonzaga Manuscripts," *Discovery No. 4*, ed. Vance Bourjaily (New York, 1956).

1958 "Leaving the Yellow House." *Esquire*, 49 (January 1958), 112-26.
1965 "A Wen" (play). *Esquire*, 63 9January 1965), 72-74, 11.

Reviews

"Beatric Webb's America." *Nation*, 197 (September 7, 1963), 116.
"Dreiser and the Triumph of Art." *commentary*, 11 (May 1951), 502-3.
"Gide as Autobiographer," *New Leader*, June 4, 1951, p.24.
"Hemingway and the Image of Man," *Partisan Review*, 20 (May-June 1953), 338-42.
"Italian Fiction: Without Hope," *New Leader*, December 11, 1950, 21-22.
"Laughter in the Ghetto," *SRL*, 36 (May 30, 1953), 15.
"Movies, *Horizon*, 5 (September 1962), 108-10.
"Movies," *Horizon*, 5 (November 1962), 110-12.
"Movies," *Horizon*, 5 (January 1963), 111-13.
"Movies," *Horizon*, 5 (March 1963), 109-11.
"A Personal Record," *New Republic*, 130 (February 22, 1954), 20.
"Pleasure and Pains of Playgoing." *Partisan Review*, 21 (May-June, 1954), 312-17.
"Rabbi's Boy in Edinburgh," *SRL*, 39 (March 24, 1956), 19.
"The Riddle of Shakespeare's Sonnets," The *Griffin*, 11 (June, 1962), 4-8.
"The Swamp of Prosperity." *Commentary*, 38(July 1959), 77-79.
"Two Faces of a Hostile World," *NYTBR*, 61 (August 26, 1956), 4-5.
"The Uses of Adversity." *The Reporter*, 21 (October 1, 1959), 42-44.

Articles

"Culture Now: Some Animadersions, Some Laughs," *Modern Occasions*, 1, No. 2 (Winter 1971), 162-178.
"Deep Readers of the World, Beware!" *NYTBR*, 64 (February 15, 1959), 1,34.
"Distractions of a Fiction Writer," *The Living Novel*, ed. Granville Hicks (New York, 1957)1-20.
"Foreword, John Berryman, *Recovery*, (New York, 1973).
"Foreward," Isaac Rosenfeld, *An Age of Enormity*, ed. Theodore Solataroff (Cleveland, Ohio, 1962).
"The French as Dostoevsky Saw Them," *New Republic*, 132 (May 23, 1955), 17-20.

"How I wrote Augie March's Story," *NYTBR*, 59 (January 31, 1954), 3,17.
"Illionois Journey," *Holiday*, 22 (September 1959), 62, 102-7.
"introduction," *Great Jewish Short Stories*, ed. Saul Bellow (New York: Dell, 1963), 9-16.
"Isaac Rosenfeld," *Partisan Review*, 23 (Fall 1956), 565-67.
"The Jewish Writer and the English Literary Tradition," *Commentary*, 8 (October 1949), 366-67.
"Literary Notes on Khruschev," *Esquire*, 55 (March 1961), 106-7.
"Literature," *The Great Ideas Today*, (New York: Encyclopedia Britannica Inc., 1963), 135-79.
"Machines and Story Books: Literature in the Age of Technology," *Harper's* 249, No. 149, (August 1974), 48-59.
"My Man Bummidge," *New York Times*, September 27, 1964. Section 2,1.
"The Nobel Lecture," *The American Scholar*, 46, No. 3 (Summer, 1977), 316-325.
"Recent American Fiction," Lecture delivered under the auspices of the Gertrude Clarke Whittal Poetry and Literature Fund (Washington: Library of Congress, 1963), *Encounter*, 21 (November 1963), 22-29.
"The Sealed Tresure," *The Open Form*, ed. Alfred Kazin (New York, 1961), 3-9.
"Spanish Letter," *Partisan Review*, 15 (February 1948), 217-30.
"A Talk with the Yellow Kid," *The Reporter*, 15 (September 6, 1956), 41-44.
"Thinking Man's Wasteland," (Excerpt from address), *Saturday Review*, 48 (April 3, 1965), 20.
Translation of I.B. Singer's "Gimpel the Fool," *Partisan Review*, 20 (May-June, 1953), 300-13.
"The University as Villain," *Nation*, 185 (November 16, 1957), 361-63.
"A World Too Much with Us," *Critical Inquiry*, 2 No. 1. (Autumn 1957), 1-9.
"Where Do We Go from Here: The Future of Fiction," *Michigan Quarterly Review*, 1 (Winter 1962), 27-33.
"A Word from Writer Directly to Reader," *Fiction of the Fifties*, ed. Herbert Gold (new York, 1959), 19.
"The Writer and the Audience," *Perspectives USA*, 9 (Autumn, 1954), 99-102.
"The Writer as Moralist," *Atlanitc*, 211 (March 1963), 58-62.
"Writers and Morals," Unpublished articles in Saul Bellow papers at the

Joseph Regenstein Library, University of Chicago, Chicago.

The Noble Savage

Edited by Saul Bellow, this periodical contains unsigned articles by him.

"Number One," Saul Bellow, Keith Botsford, and Jack Ludwig (New York, 1960).

"Number Two," ed. Saul Bellow, Keith Botsford, and Jack Ludwig (New York, 1960).

"Number Three," ed. Saul Bellow, Keith Botsford (New York, 1961).

"Number Four," ed. Saul Bellow, Keith Botsford (New York, 1961).

"Number Five," ed. Saul Bellow, Keith Botsford and Aaron Asher (New York, 1962).

Biographical Material And Interviews

"Bellow on Himself and America," *Jerusalem Post, No.* 507, July 13, 1970.

Breit. Harvey, "Saul Bellow," *The Writer Observed* (New York, 1961), 176-78.

Harper. G.L, "Saul Bellow: An Interview," *Paris Review*, 36 (Winter 1966), 49-73.

Henry, Jim Douglas, "Mystic Trade," *The Listener*, May 22, 1969.

Howard, Jane, "Saul Bellow Considers this Planet." *Life* 68, No. 12 (April 3, 1970), 57-60.

Kazin, Alfred, "My Friend Saul Bellow," *The Atlantic*, 215 (January 1965), 51-54.

Kulshrestha, Chirantan. *The Saul Bellow Estate* (Calcutta, 1976).

"An Indian Writer Remembers Saul Bellow," *Span*, Vol. XIX. No. 2, February 1977, 31-35.

"Meeting Saul Bellow," *The American Review*, 16, No. 3 (April 1972), 77-84.

"A Conservation with Saul Bellow," *Chicago Review*, 23, No. 4 and 24 No. 1,7-15.

Kunitz, Stanley, J. *Twentiety Century Authors*, First Supplement (New York, 1955), 72-73.

"Saul Bellow: An Interview," *Wisconsin Studies in Contemporary Literature*, 6 (Summer 1965), 156-60.

Steers, Nina A., "Successor to Faulkner?" *Show*, 4 (September 1964), 36-38.

General Criticism

Aldridge, John W, "The Society of Three Novels," *In Search of Heresy*, (New York, 1956).
Alter, Robert, *Rouge's Progress: Studies in the Picaresque Novel* (Cambridge. Mass 1964).
"The Stature of Saul Bellow," *Midstreasm*, 10 (December, 1964), 30-15.
Atlas, James, Delmore Schwartz: *The Life of an American Poet* (New York, 1977)
Auerbach, Erich, *Mimesis*, (New York, 1957).
Axthelm, Peter M. *The Modern Confessional Novel* (New Haven, 1967)
Baumbach, Jonathan, *The Landscape of Nightmare* (New York, 1965), 35-54.
Berdyaev, *Nicolas, Dostoievsky*, trans. Donal Attwater (New York, 1934).
Bergler, Edmund, "Written of Half-Talent," *American Image* 14 (Summer 1957), 155-64.
Bergman, Ingmar, *Four Screen plays of Ingmar Bergman*, trans. Lars Malmstrom and David Kusher (new York, 1966).
Boyers, Robert, "Nature and social Reality in Bellow's Sammler," *The Critical Quarterly*, 15, No. 3 (Autumn 1973), 251-271.
Bradbury Malcolm, "Saul Bellow's The Victim," The *Critical Quarterly*, 5 (Summer 1963), 119-27.
"Saul bellow and the Naturalist Tadition," *Review of English Literature*, 4 (October 1963), 80-92.
Buber, Martin, *Eclipse of God* (New York 1952).
Chase, Richard, "The Adventures of Saul Bellow: Progress of a Novelist, *Commentary*, 27 (April 1959), 323-30.
Clayton, John J., *Saul Bellow: In Defense of Man* (Bloomington 1971).
Cohen, Sarah Blacher, *Saul Bellow's Enigmatic Lauhgter* (Urbana, 1974).
Cook Bruce, "Saul Bellow: A Mood of Protest," *Perspective*, 12 (February 1963), 47-50.
Crozier, R.D., "Theme in Augie March, "Critique, 7 (Spring 1965), 18-32.
Davis Robert G. "The American Individualist Tradition: Bellow and Styron," *The Creative Present*, ed. N. *Balakain* and C. Simmons (Garden City, N.Y. 1963), 111-41.

Saul Bellow's Fiction (Carbondale, 1969).
May, Rollo, etc. ed. *Existence* (New York, 1958).
Opdahl, Keith Michael, *The Novels of Saul Bellow: An Introduction* (University Park, Pennsylvania, 1967).
Podhoretz, Norman, *Doings and Undoings* (New York, 1964), 205-27.
Porter, Gilbert, *Whence* The Power? *The Artistry and Humanity of Saul Bellow* (Columbia, 1974).
Quinton, Anthony, "The Adventures of Saul Bellow," *London Magazine*, 6 (December 1959), 55-59.
Rajan, B., etc., ed. *Focus Two* (London, 1946).
Rans, Geoffrey, "The Novels of Saul Bellow," *Review of English Literature*, 3 (October 1963), 18-30.
Rosenberg, Harold, *The anxious Object* (New York, 1969).
Discovering the Present (Chicago, 1973).
Ross, Theodore J. "Notes on Saul Bellow," *Chicago Jewish Forum*, 18 (Fall 1959), 21-27.
Rovit, Earl, *Saul Bellow* (Minneapolis, 1967). N.J. *Saul Bellow: A Collection of Critical Essays* (Englewood Cliffs, 1975).
Salmagundi, No. 30 Summer 1975 (Special Number on "Saul Bellow: Literature and Cultgure.")
Salter, D.P.M. "Optimism and Reaction in Saul Bellow's Recent Work," *The Critical Quarterly*, 14, NO. 1 (Spring 1972), 57-66.
Samuel, Maurice, "My Friend, the Late Moses Herzog," *Midstream*, 12 (April 1966), 3-25.
Scheer-Schazler, Brigitte; *Saul Bellow* (New York, 1972).
Schulz, Max F. *Radical Sophistication* (Athens, 1969).
Scott, Jr., Nathan A., *Three American Moralists: Mailer, Bellow, Trilling* (Notre Dame, 1973)
Simpson, Louis, "Ghost of Delmore Schwartz," *New York Times Magazine*, December 7, 1975, pp. 38-56.
Tanner, Tony, *Saul Bellow* (Edinburgh, 1965). *City of Words: American Fiction* (1950-70), (New York, 1971)
Tillich, Paul, *The Courage To Be* (New Haven, 1968).
Trilling Lionel, *Beyond Culture* (New York, 1965). Sincerity and Authenticity (Cambridge Mass., 1973)
Weinberg, Helen, *The New Novel in America: The Kafkan Mode in Contemporary Fiction* (Ithaca, 1970).
Young, J.D. "Bellow's View of the Heart." *Critique*, 7 (Spring 1965), 5-17.

عصر حاضر کا عظیم کہانی کار

آئزک بشیوز سنگر

۱۹۷۸ء میں دنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام (نوبیل ادبی انعام) پانے والا پولینڈ نژاد امریکی کہانی کار آئزک بشیوز سنگر، جو خود کو سنگر کی بجائے آئزک کہلانا پسند کرتا ہے[1]، اپنے قارئین کی نظر میں یدش کا سب سے بڑا ناول نگار اور کہانی کار رہے[2]۔ آئزک کے بارے میں ادبی ماہرین کا خیال ہے کہ ارنسٹ ہیمینگوے (۱۸۹۹ء۔ ۱۹۶۱ء) اور ولیم فاکنر ۱۸۹۷ء۔ ۸۲ کے انتقال کے بعد امریکی کہانی کاری کے فلک الافلاک پر جو خلا پیدا ہو گیا تھا، وہ نہ صرف آئزک کی کہانی نے پُر کیا بلکہ اپنے جاندار اسلوب، تازہ موضوعات اور زندگی سے کھلی کمٹمنٹ کے سبب کہانی (افسانہ اور ناول) کو کئی ڈگ آگے نکال کرلے گیا[3]۔

عصر حاضر کا یہ منفرد افسانہ نگار آئزک بشیوز سنگر، جو ۱۹۳۵ء سے امریکہ میں آباد ہے، ۱۴ جولائی ۱۹۰۴ء میں پولینڈ کے ایک قصبے ریذی مین REDZYMIN میں ایک یہودی ربی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے والد PINCHAS MENACHEN SINGER ایک مشہور ربی تھے[4] جبکہ اس کی والدہ BATH SHEBA ایک ممتاز ربی کی بیٹی تھیں۔ اس حوالے سے آئزک کا ددھیال اور ننھیال دونوں کٹر مذہبی گھرانے تھے جس کے اثرات

آئزک کے فن اور شخصیت دونوں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

آئزک کا بڑا بھائی اسرائیل جوشوا سنگر، جو ادب میں آئی جے سنگر کے نام سے معروف ہے، نہ صرف یدش کا ایک ممتاز ناول نگار تھا بلکہ آئزک کی ذہنی و فکری ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ گو اس کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوگیا تھا مگر اس کے دو ناول YOSHI KALB اور THE BROTHERS ASHKENAZI اس کا نام ادب میں زندہ رکھنے کے لئے بہت ہیں۔ آئی جے سنگر کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ آئزک ابھی چار برس کا تھا کہ اسے اپنے خاندان کے ساتھ نقل مکانی کرکے ریڈی مین سے پولینڈ کے موجودہ دارالحکومت وارسا منتقل ہونا پڑا۔ آئزک کے کسی سوانحی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اپنا آبائی قصبہ کیوں چھوڑا، مگر وارسا آنے کے بعد انہوں نے یہودیوں کی ایک غریب بستی کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا۔ آئزک کے والد نے اس بستی میں ربانیت کی درس و تدریس کے لئے ایک کی تشکیل کی جہاں وہ درس و تدریس کے علاوہ اپنے خاندانی اور علاقے کے دیگر مسائل حل کرنے کا کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ اسی عمارت کے ایک حصّے میں ان کی رہائش بھی تھی۔

آئزک یہودی لوک ورثہ اور مذہبی کہانیوں کو بڑے شوق سے سُنا کرتا، جن کے بارے میں اس کے والد کہا کرتے تھے کہ یہودیوں کا یہ سرمایۂ افتخار اس کے مذہبی عقیدے کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ عجیب و غریب قصے اور کہانیاں اس حد تک اس کے لاشعور کا حصّہ بن گئے کہ وہ ذہنی طور پر اسی عہد میں زندہ رہنے لگا۔

"میرے اندر ایک احساس نے جنم لیا کہ میں بھی ایک انہونے ایڈونچر کا حصّہ ہوں، جسے (شاید) وقوع پذیر نہیں ہونا ہوتا، مگر وہ میری صورت میں رونما ہوا۔"

ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"ایڈونچرز (حادثوں) نے میرے گھر کو دیکھ لیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ حادثوں نے مجھے اس وقت ہی دیکھ لیا تھا، جب سے میں نے یہودی تاریخ کا مطالعہ شروع کیا اور اب تک اس کا اسیر ہوں۔" ۳؎

ہر مذہبی طبقے کی نسبت یہودی مذہب قدیم تاریخی تواتر رکھنے، قدیم تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے امین ہونے کی وجہ سے عجیب و غریب لوک ادب، اساطیر اور دیومالائی داستانوں سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ بچپن سے ہی یہودی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہودی دیو مالا، اساطیر اور مذہبی لوک ورثہ بھی یہودی بچے کے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے اور اس طرح مذہبی انتہا پسندی اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ آئزک کا بچپن اپنے باپ کی قربت میں گزرا، جو لوگوں کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے اکابرین یہود سے دلیلیں اور لوک ورثہ کی ثروت سے استدلال کرتا تھا، آئزک اپنے باپ کی شخصیت کا اسیر تھا چنانچہ اس کی ذہنی نشوونما کے پیچھے بچپن کا یہ دور ساری زندگی اس کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔ اس کے اسی رویے کو دیکھتے ہوئے اسے یہودی لوک ورثے اور مذہبی پراسراریت سے لبریز فکری نیابت کا لکھاری کہا گیا۔ یہاں یہ امر بھی بطور خاص سامنے رہنا چاہیئے کہ جن علاقوں میں اس کا بچپن گزرا، وہ بستیاں یہودی غریب طبقوں پر مشتمل تھیں، چنانچہ زندگی کی بے توقیری اور معاشرے میں یہودیوں کی کسمپرسی نے اسے تلخ حقیقتوں کا شناور بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی کہانیوں میں لوک ورثے کی پراسراریت اور مشرقی یورپ میں یہودیوں کی معاشرتی زندگی کی تلخیاں ہم آمیز نظر آتی ہیں، یدش سے اس کا انتہائی جذباتی لگاؤ بھی اسی لاشعوری تجربات کا سبب ہے، جو بچپن کو جوان کرتے ہوئے اس نے حاصل کئے۔ آئزک اپنے

آباء کی طرح اس بات پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ لوک ورثہ مذہبی عقیدے کی جڑوں میں پیوست کرنے اور توانائی بخشنے میں بنیادی کردار رکھتا ہے وہ اپنے بچپن کو، جوانی کو اور تمام عمر کے تجربات کو اپنے فن کی اساس بنانے میں اسی لئے کامیاب ہوا ہے کہ اس نے تاریخ سے لے کر اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے تک کو اپنے شعور میں محفوظ کر لیا تھا۔

HE WRITES ABOUT A WORD THAT GONE DESTNOYED BY BRUTALY BEYOND COMPARISION AND HE DOES ALL THIS WITHOUT A SIGN OR APOLOGY WITH SO MUCH AS JEWISH GROON. IT STRI ONE AS A KIND OF INSPIRED MADNESS

آئزک کے بچپن کے تلخ حالات نے اس کی ساری زندگی کو اپنی گرفت میں رکھا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ BELGORI چلا گیا۔ لیکن ۱۹۱۷ء تک پہنچنے کے لئے اس نے دو سال زندگی کے بدترین دن دیکھے تھے۔ ۵

۱۹۱۵ء میں شہر پر جرمنی کے قبضے کے بعد اشیائے خوردنی کی کمی اور بھوک نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہودیوں کی زندگی اس حد تک تشویش ناک صورت اختیار کر گئی کہ " نومبر ۱۹۱۵ء میں یہودیوں کے گھر روشنی اور بیت الخلائک سے محروم ہو گئے اور جو لوگ مذہبی کتابوں کو اب بھی اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے تھے، قحط کا شکار ہونے لگے۔ اس سال سردی بھی شدت کی تھی۔ گیس کی سپلائی منقطع تھی، اور وہ گھروں میں ضروریات سے محروم تھے۔"

۱۹۱۷ء کے لگ بھگ شہر میں بھوک اور قحط کے ساتھ ٹایئفائیڈ نے حملہ کر دیا۔ دواؤں کی کمی، خوراک کی کمی ، زندگی کے لئے ضروری وسائل کے فقدان اور خوف نے زندہ رہنے کے امکانات کم کر دیے۔

۱۹۱۷ء میں آئزک کی والدہ باتھشیبا نے ایک خواب دیکھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ گو ایسی کوئی اطلاع تو نہ ملی مگر اسے یقین تھا کہ اس کا خواب سچا ہے اور اسے BILGORAY جانا چاہیئے۔

۱۹۱۷ء میں آئزک ۱۳ سال کا ہو گیا۔ ۱۳ سال کی عمر یہودی معاشرت کے مطابق ایک

نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، مگر نہایت مخدوش حالات کے سبب نہ تو اس کی تقریب منعقد ہو سکی اور نہ ہی اسے کوئی اہم تحفہ ملا۔ مگر اسے BILGORAY جانے اور یہ وارسا سے باہر نکلنے کا ایک شاندار موقع ضرور ہاتھ آ گیا۔ اس کے والدان دنوں ریڈیمن میں معروف تھے، جوشیا ابھی ساتھ نہ ہوا، لیکن ماں بہن اور وہ تینوں سفر پہ آمادہ تھے۔

روانگی سے قبل ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا، ان دنوں BILGORAY پر آسٹریا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا اور وہاں جانے کے لئے ویزا کی ضرورت تھی اور یہ کام آسان نہ تھا۔ بڑی دشواریوں کے بعد بالآخر ویزے کا حصول ممکن ہوا۔ یہاں ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہو گیا کہ اس کی والدہ کو یہ احساس ستانے لگا کہ وہ اپنے خاوند اور بچوں کا گھر چھوڑ کر ایک گناہ کا ارتکاب کر رہی ہے لیکن آئزک سنگر کو کوئی ایسا احساس تنگ نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانے پر خوش تھا۔

سردیوں کی ایک شام وہ بلگورے کے لئے روانہ ہوئے۔ جونہی وہ ٹرین میں سوار ہوئے اور اس کی ماں نے اسے دودھ اور بسکٹ کھانے کو دیئے تو وہ آن واحد میں پیچھے رہ جانے والے وارسا شہر، گھر، محلے، سڑکیں، گلیاں، درخت، جنگ، بھوک، بیماری یہاں تک کہ وہ وارسا کے آئزک کو بھی بھول گیا۔ ؎

تین دن کی مسافت کے بعد جب وہ سفر کے آخری مرحلے میں تھے تو ایک اسٹیشن پر باتھ شیبا کے گاؤں کی کچھ خواتین سے ملاقات ہوئی، انہوں نے باتھ شیبا کے خواب کو نہ صرف سچ جانا، بلکہ والد کے ساتھ والدہ اور اس کے خاندان کے کچھ اور لوگوں کی موت کی خبر بھی سنائی۔ بلگورے میں اس کے ماموں اور اس کی تیسری بیوی نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور زندگی کی آسودگیوں میں انہیں شریک کر لیا۔ آئزک کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ بلگورے کی وہ حالت نہیں ہے، جو وہ یہودیوں کے حوالے سے وارسا میں دیکھ آیا تھا۔ یہاں کی معاشرتی زندگی میں انہیں تمام سہولتیں حاصل تھیں، یہاں تمام

یہودی آسودہ زندگی بسر کرتے اور مذہبی عبادات کو دن میں تین مرتبہ ادا کرتے نظر آئے۔ خواتین خوش اور آسودہ تھیں۔ وہ اپنے بال تراشتیں اور اپنی زندگی کے معمولات کو مذہبی روایتی انداز سے پورا کرتی تھیں۔ چھٹی کا دن آئزک کے لئے پُرمسرت اور حیران کن تھا۔ اس نے بلگورے کی اس زندگی کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ ہزاروں سالوں کے سفر نے بھی یہودی رسم و رواج کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا۔ اور وہ اب بھی چھٹی کے اختتام کے دن پر روایتی روٹی METRO کھاتے اور عبادت گاہ کی دیواروں سے گریہ کرتے:

" قدیم یہودیوں کی اس دنیا میں مجھے روحانی توانائی کا ایک بے پایاں خزانہ دستیاب ہوا۔ بلگورے میں مجھے موقع ملا کہ میں اپنے ماضی کو اصل صورت میں دیکھ سکوں۔ وقت جیسے پیچھے لوٹ گیا تھا۔ میں یہودی تاریخ کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔" [۱۳]

لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ آہستہ آہستہ یہودی نظریات کے خلاف ردِعمل سوشلزم کی باتوں اور ہڑتالوں کے سبب یہودیوں کے لئے معاشی وسائل کم ہونے لگے، اکثر یہودی محنت مزدوری کرنے لگے اور رفتہ رفتہ صورتِ حال اتنی خراب ہوئی کہ دو یہودی بہنوں نے ایک یہودی عبادت گاہ کے قریب قحبہ خانہ قائم کر کے جسم فروشی کا کاروبار شروع کر دیا۔

بلگورے کی اس زندگی کے بارے میں وہ کبھی مکمل صورتِ حال کو نہیں لکھ سکا۔ البتہ اس نے اپنے پہلے ناول SATAN IN GORAY میں دو کرداروں BENICH اور ربی RACHELE کے ذریعے یہاں کی صورتِ حال کو بیان کرنے کی قدرے کوشش کی۔

اسے یہاں کے ایک ترکی سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا مگر جلد ہی وہ ٹائیفائیڈ کے حملے کے بعد بستر پر پڑ گیا۔ وہ بیماری کے شباب کے دنوں میں ایک خواب بار بار دیکھتا

تھا کہ تین عورتیں اس کے گلے میں رسی ڈال کر اسے مصلوب کر رہی ہیں۔ مگر ماں کی شفقت اور چیک ڈاکٹر کے علاج سے وہ صحت یاب ہو گیا اور دو بارہ سکول جانے لگا۔ ان ہی دنوں اسے خبر ملی کہ اس کا بھائی وارسا میں سخت بیمار ہے۔ بلگورے کی حالت بھی روز افزوں خراب ہونے لگی تھی۔ ہر روز روس میں ایک نئے انقلاب کی خبریں سنائی دیتیں جو یہودیوں میں امید پیدا کرتیں مگر روس میں ردعمل ہونے والا سوشلسٹ انقلاب اپنی جگہ قائم تھا۔ بلکہ اب بالشویک نظریات رفتہ رفتہ بلگورے کی زندگی پر اثر انگیزی کرنے لگے تھے۔ بھوک کے سائے نظر آنے لگے۔ آسائشوں کی جگہ ضروریاتِ زندگی کی کمی سر ابھارنے لگی اور ایک بڑی تعداد میں پولینڈ سے یہودی یہاں آکر یہاں کی معیشت پر بوجھ بن گئے۔ وقت اس ڈگر پر چلنے لگا کہ آئزک سنگر کو مذہبی لٹریچر سے بے زاری محسوس ہونے لگی۔ اس نے اب ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں یہودی لکھاریوں کی تحریروں کو پڑھنے لگا اور جب گندم کی بوریوں کے ساتھ امریکی لٹریچر یدش میں ترجمہ ہو کر بلگورے پہنچا تو امریکی ادیبوں کے ساتھ ساتھ اس کو ترگنیف، تالستائی، چیخوف، موپساں اور سٹرینڈ برگ کے مطالعے کا موقع بھی ملا۔ کچھ عرصہ قبل جب اس نے سپائنوزا کو پڑھنا شروع کیا تو اس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتسم ہونے لگے تھے، مگر جب اس کا مطالعہ وسیع ہوا تو اسے اپنے خیالات کا وہ ہالہ ٹوٹتا محسوس ہوا، جو سپائنوزا کی فکر اور ادب سے قائم ہوا تھا۔

اسی دوران اسے ایک پرائیویٹ ادارے میں عبرانی پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ وہ ایک شرمیلا لڑکا تھا۔ مگر اب اس کے سامنے اس کی طالبات بچیاں نہ تھیں جوان اور خوبصورت خواتین تھیں جو اپنے بہترین لباسوں میں پورے سج دھج کے ساتھ آیا کرتیں ان لڑکیوں میں ٹوڈورا نام کی ایک طالبہ بھی تھی جو سائنس اور فلسفے میں دلچسپی لیتی تھی۔ ان

میں قربت بڑھی اور دونوں میں طویل مکالمے ہونے لگے۔ ٹوڈورا نے اسے آئن سٹائن اور دیگر سائنسی نظریات کے بارے میں مبادی علم دیا۔ سائنس آئزک سنگر کا موضوع نہ تھا۔ چنانچہ ٹوڈورا کے ساتھ سائنس کے موضوعات پر گھنٹوں بات چیت کرنا، اس کی دلچسپی بڑھنے لگی جو موضوع میں بھی تھی اور ٹوڈورا میں بھی۔

درس و تدریس کے اسی سلسلے نے جہاں آئزک سنگر میں ایک اعتماد پیدا کیا وہیں اس پر شہرت کے جہان تازہ بھی کھلنے لگے، مگر اس کی زندگی کا یہ نیا انداز اس کی ماں اور دوسرے رشتہ داروں کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے اس کی اس زندگی کو بے راہروی سے تعبیر کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم کی طرف توجہ دے تاکہ وہ اپنے باپ دادا، نانا، ماموں اور دیگر اہلِ خاندان کی طرح ربی بن سکے۔ اسی دوران پولینڈ نے ۱۹۱۸ء میں آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس کے والد SHTETLE میں ربی ہو کر آ گئے، جو بلگورے سے زیادہ دوری پر نہ تھا۔ باتھ شیبا نے اپنے خاوند کے پاس جانے کا فیصلہ کیا، تو آئزک سنگر نے ایک نئے جہان میں قسمت آزمائی کے لئے وارسا جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کی والدہ نے محض اس شرط پر اسے جانے کی اجازت دی کہ وہ وارسا جاکر دوبارہ ربانیت کی تعلیم شروع کرے اور ربی بن کر آئے۔ اس دوران آئزک سنگر مذہبی تاریخ اور زندگی کو قریب سے دیکھ چکا تھا۔

اس نے مشرقی یورپ میں آباد یہودی بستیوں کی بود و باش دیکھی اور خاص طور پر یہودی روایتی قصبے SHTETLE کی معاشرتی زندگی کے بارے میں پڑھا۔ جہاں سے اس کے ذہن پر زندگی کی تلخ حقیقتوں کے نئے زاویے مرتب ہونا شروع ہوئے۔ آئزک پر اس کے بھائی جوشوا کے گہرے اثرات بھی تھے۔ اسرائیل جوشوا سنگر ان کے خاندان کا پہلا فرد تھا، جس نے کٹر مذہبی روایت کو توڑنے کی جرأت کی اور مذہبی درس و تدریس

کے خاندانی پیشے سے بغاوت کرکے پینٹنگ اور لکھنے کی طرف راغب ہوا۔ ۲۲ سال کی عمر یعنی (۱۹۱۵ء) میں پولینڈ کی دردناک زندگی کے بارے میں اس کی کہانیاں طبع ہونا شروع ہوئیں۔ ۱۹۱۸ء میں اس نے جینیا GENIA سے شادی کی اور ۱۹۱۹ء میں روس چلا گیا۔ جہاں سے ۱۹۲۱ء میں وارسا واپس آیا۔ اس دوران اس کی کہانیاں یدش میں بدستور شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ادبی جریدے LITERARRISHE BLETER کا شریک مدیر ہوا۔ آئزک سنگر کو ادب کی طرف راغب کرنے میں اسرائیل جوشوا سنگر نے اہم کردار ادا کیا۔ جوشوا سنگر کی کہانیوں میں مذہبی زاویہ نظر سے زیادہ عقلیت پسندی کا رجحان نمایاں ہے۔ جوشوا سنگر کے رویے کو دیکھتے ہوئے آئزک سنگر کے والدین نے اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف مبذول کرکے اسے مذہبی سکالر اور ربّی بنانے کی کوششیں تیز کردیں مگر آئزک نے اپنے بھائی کے گہرے اثرات کے تابع ایک سیکولر ادیب بننے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ وارسا آگیا۔ وارسا آنے کے بعد اس نے ایک مذہبی ادارے میں مزید ربانیت کا درس لینے کے لئے داخلہ تو لے لیا مگر اب اس کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔ اس نے بمشکل ایک برس ہی اس ادارے میں گزارا ہوگا کہ اپنے طبعی رجحان کے سبب اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگیا، اسی دوران اس نے نٹ ہمسن KNUT HAMSUN کا مطالعہ کیا۔ جس نے اس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ یہ دور اس کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ نہ اس کے پاس رہنے کی جگہ تھی اور نہ ہی کھانے کے لئے خوراک کا بندوبست۔ اس کی حقیقت ایک بے گھر بھکاری سے زیادہ نہ تھی۔ یہیں اسے احساس ہوا کہ جانوروں کی زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہے۔ آئزک اس ماحول میں جگہ نہ پانے کے سبب ۱۹۲۲ء میں واپس بلگورے اپنے والد کے پاس چلا گیا اور جب ۱۹۲۳ء میں جوشوا ادبی جریدے کا شریک مدیر ہوا، تو اس نے آئزک سنگر کو وارسا بلا لیا، جہاں وہ جوشوا کی شریک

ادارت میں ادبی جریدے LITERARRISHE BLETÈR میں پروف ریڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ مگر اس سے رہائش کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ جوشوا اور اس کا خاندان ایک کمرے پر مشتمل اپارٹمنٹ میں رہتے تھے، جس میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ وہ ایک اور اخبار کے ادبی صفحہ کے مدیر میلش راویش کے ساتھ ایک پرانی عمارت کے پانچویں منزل کے ایک تنگ سے کمرے میں رہنے لگا۔ اوّل اوّل اس نے عبرانی میں لکھنا شروع کیا جو اس کے آبار کی زبان تھی، مگر بعد میں اس نے یدش میں طبع آزمائی کی۔ عبرانی اس وقت زیادہ حلقہ اثر نہ رکھتی تھی جبکہ یدش میں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ موجود تھا۔

۱۹۲۷ء میں جب جوشوا سنگر کا پہلا ناول STEEL AND IRON شائع ہوا تو اسی سال آئزک سنگر کی پہلی کہانی IN OLD AGE شائع ہوئی۔ اسی دوران جب جوشوا کی بیوی جینیا بیمار ہو کر تپ دق کے ایک ہسپتال میں داخل تھی، اس کی ملاقات رونیا RUNYA سے ہوئی جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوا۔ رونیا سے اس کی شادی یہودی رسم و رواج کے مطابق نہ ہوئی تھی، مگر اس کے باوجود انہوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی کے کئی سال ایک ساتھ گزارے۔ ۱۹۲۹ء میں ان کے ہاں پہلے بیٹے اسرائیل کی پیدائش ہوئی اور اسی سال اس کا باپ بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ آئزک پروف ریڈر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر جرائد میں مضامین اور ترجمے کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ایک ادبی جریدے گلوبس GLOBUS کا شریک مدیر ہو گیا۔ اس کی ادارت کے دوران اس کے ابتدائی دور کی کئی کہانیاں اس جریدے میں شائع ہوئیں اور یہیں سے اس نے بعض فرانسیسی جرمن اور انگریزی زبانوں کے ادبی سرمایے کو یدش میں ترجمہ کیا۔ ان میں تھامس مان کی تخلیق THE MAGIC MOUNTAIN بھی شامل ہے۔[۱۱] ان ہی دنوں پن کلب وارسا کی طرف سے اس کا پہلا ناول SATAN IN GORAY

شائع ہوا جس نے آئزک کو یدش کے ادیبوں کے اہم لکھاریوں میں شامل کرا دیا۔ اب آئزک بشویس سنگر ادب کی دنیا میں پہچانا جانے لگا تھا مگر اسے اس بات کا دُکھ تھا کہ اسے قارئین کا جتنا بڑا حلقہ چاہیئے وہ وارسا میں دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے وارسا چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے بھائی جوشوا سنگر سے رابطہ کرکے، جو ان دنوں امریکہ میں تھا، خود بھی ۱۹۳۵ء میں امریکہ چلا آیا۔ امریکہ روانہ ہونے سے ایک سال قبل اس کے اور رونیا کے درمیان اختلافات کی دیوار حائل ہونے لگی جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۳۲ء میں ان کی علیٰحدگی پر منتج ہوا۔ رونیا اپنے بیٹے اسرائیل کے ساتھ روس چلی گئی جہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد فلسطین میں ہجرت اختیار کی۔ ان دنوں اس کا بیٹا اسرائیل، اسرائیل کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ امریکہ آنے کے بعد اس نے اپنی رہائش کے لئے نیویارک کو منتخب کیا اور مختلف یدش جرائد کے لئے کہانی، مضامین اور تبصرے لکھنے لگا۔ وہ کسی اخبار یا جریدے سے باقاعدہ منسلک تو نہ ہوا لیکن نیویارک آنے کے بعد اس نے جیویش ڈیلی فارورڈ JEWISH DAILY FORWARD کے لئے ابتداء سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا، جو اصل میں اس کی شہرت اور ناموری کے پیچھے مضبوط سہارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

امریکہ میں یدش قارئین کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا۔ شروع شروع میں اس نے ارادہ کیا کہ وہ انگریزی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے، مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ انگریزی میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جبکہ یدش کے لکھاریوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ وہ خود اس صورتِ حال کے بارے میں ایک جگہ کہتا ہے:

" شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ یدش زبان کا یہاں حلقۂ اثر محدود ہے اور یدش ایک مردہ زبان ہے، مگر ۵ سال تک استقامت سے لکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نہ صرف یدش ایک زندہ زبان ہے

بلکہ یہ ستور ایک وسیع حلقہ رکھتی ہے۔"[۱۱]

یدش میں لکھتے ہوئے آئزک سنگر کو سخت محنت کرنی پڑی۔ ایک طرف اپنی شخصیت کو تسلیم کرانے کا مسئلہ تھا، تو دوسری طرف مسلسل لکھنے سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرنا اس کے مطمح نظر کا حصّہ تھا، وہ مختلف جرائد و رسائل میں لکھتا رہا تا آنکہ اس نے اپنی ادبی حیثیت کو بالآخر منوالیا اور ۱۹۴۳ء میں وہ جیوش ڈیلی فارورڈ کا باقاعدہ لکھاری بن گیا، مگر اس نے محنت اور کوشش کا عمل جاری رکھا۔ ۱۴، فروری ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنی موجودہ بیوی ایلما سے شادی کی، جو جرمنی کی مہاجر اور میونخ سے تعلیم یافتہ تھی۔ ان دونوں کی ملاقات کا سبب وہ مشترکہ فلیٹ تھا، جہاں انہوں نے ایک ساتھ رہنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں ایلما ایک ادارے میں سیل گرل تھی اور اپنے پہلے خاوند سے دو بچوں کی ماں۔ اب آئزک کو امریکی ادبی دنیا میں جگہ ملنے لگی۔ اس نے ۱۹۴۳ء میں امریکی شہریت بھی حاصل کر لی اور جب اس کا ناول THE FAMILY MOSKAT انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا تو اسے اچانک شہرت کا ایک بڑا دریا مل گیا۔ اس کا یہ ناول پہلے ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ جیوش ڈیلی فارورڈ میں قسط وار شائع ہوا اور بعد ازاں ۱۹۴۵ء میں کتابی شکل میں یدش ہی میں شائع ہوگیا۔ اس ناول میں جہاں اس نے پولینڈ میں یہودی معاشرت کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے، وہیں اس نے اس ناول کا انتساب اپنے بڑے بھائی کے نام کیا، جس نے اسے ادب میں لانے میں مدد دی، جسے وہ روحانی باپ اور استاد کا درجہ دیتا ہے۔ آئزک سنگر کے اس ناول نے نقادوں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور بڑے پیمانے پر اس کی کوشش کو سراہا گیا، مگر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے اس پر کڑی تنقید کی اور اسے نستلجیا کا شکار ایک یہودی ادیب قرار دیا۔ مگر ایسے تبصروں کی تعداد زیادہ تھی، جنہوں نے ناول کو حقیقی زندگی اور اعلیٰ فنی کوشش

کے حوالے سے دیکھا۔" آئزک نے ناول کو رومانیت اور جذباتیت میں آلود کرنے کی بجائے ایک انوکھے طرز اور مضبوط روایت اور لوک رس کے ساتھ پیش کیا ہے۔" رچرڈ پلانٹ کی اس رائے کی طرح چارلس میڈیسن اسے پڑھتے ہوئے شدید جذبات و احساسات کے ساتھ " دارسائی حقیقی زندگی " کا شاہکار قرار دیتا ہے۔" دی فیملی موسکیٹ " نے آئزک کے لئے آگے بڑھنے کے تمام راستے وا کر دیئے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے منہاج رفعت پر پہنچ گیا۔ اس ناول نے ۱۹۵۰ء میں لوئس لیمڈ پرائز LOVIS LAMGED PRIZE حاصل کیا اور جب اس کا ترجمہ اطالوی میں ہوا، تو اس ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اٹلی کے ادبی ایوارڈ SANCARELLA PRIZE سے نوازا گیا۔ اب آئزک کے سامنے کھلا میدان تھا۔ اس کی قسمت نے یاوری کی۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی ملاقات امریکہ کے معروف ادارے منڈے پریس کے سسلی ہملے CECILY HAMLEY سے ہوئی جو بالآخر دوستی پر منتج ہوگئی۔ سسلی نہ صرف اس کا دوست بن گیا بلکہ مدیر اور ناشر بھی قرار پایا، چنانچہ اس کے اولین ناول " گورے میں ابلیس " SATAN IN GORAY کی اشاعت اس ادارے سے ہوئی۔ یہ ناول بنیادی طور پر ۴۹-۱۶۴۸ء کے یہودی قتلِ عام کے پس منظر میں تحریر کیا گیا تھا، جس کے سبب جہاں ایک مخصوص طبقے نے اسے مذہبی اور نسلی حیثیت سے قبول کیا، وہیں فنی اعتبار سے اسے اعلیٰ درجے کا تجربہ بھی قرار دیا گیا۔

۱۹۵۷ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ GIMPEL THE FOOL AND OTHER SHORT STORIES منڈے پریس نیویارک سے شائع ہوا۔ گو برسوں پہلے اس کی کہانیاں ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی تھیں، مگر مجموعے کی اشاعت سے ایک ساتھ اس کے فن کے مطالعے نے اسے دوسروں سے ممیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔" جمپل دی فول اور دیگر کہانیوں" کا لینڈ سکیپ مشرقی یورپ کی یہودی آبادیوں

سے مرتب تھا، اس کی کہانیوں کا ایک پہلو اسے "جغرافیائی اور تاریخی حد بندیوں سے بلند تر بھی کر دیتا ہے۔"[۱۲] ان کہانیوں میں یہودی عقیدہ، بود و باش، لوک تہذیب اور سیاسی و معاشی حالات اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ آئزک سنگر اپنے موضوع کے اعتبار سے دوسرے یہودی کہانی کاروں سے مختلف نہیں، کہ وہ اپنی کہانی کا خمیر بھی یہودی نسلی تعصب سے اٹھاتا اور ان ہی کے مسائل سے بحث کرتا ہے مگر کہانی جس طرح ترتیب پاتی ہے وہ بالآخر اس کہانی کو ایک وسیع تناظر دینے اور اسے تنگ کینوس اور فکری رنگ و آہنگ سے بلند تر کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ اس ضمن میں اس کی ایک کہانی THE BROOCH بطور خاص پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ کہانی بنیادی طور پر ایک ایسے شخص کی ہے، جو چور، جیب کترا، رہزن اور دیگر ایسے ہی جرائم کے حوالے سے کہانی کے آغاز میں داخل ہوتا ہے۔

والف بر WOLF BER کی ایک بیوی اور بچہ بھی ہے۔ وہ تمام دن لوگوں کی جیبیں کاٹتا، تاش کھیل کر لوٹتا اور چوری کر کے پیسے پیدا کرتا ہے، مگر ذہن کے کسی ویران گوشے میں نیک انسان کی تمام صفات رکھتا ہے، جس کا اظہار کہانی کے اختتام تک نہیں ہوتا۔ وولف بر یہودی ہے اور اپنی بیوی کو ایک مکمل یہودی نیک سیرت بیوی کے طور پر دیکھتا ہے۔ ایک روز جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی نے اپنی پڑوسن کا بروچ چوری کر لیا ہے، تو اس کی ذات یکلخت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور اس کا اپنی بیوی پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور بیوی سے کہتا ہے کہ اس گھر میں دو چور ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور یوں وولف نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ یہ کہانی یوں تو یہودی معاشرت کی کہانی ہے مگر فنی اعتبار سے اٹھتی ہوئی پوری انسانیت اور معاشرت کی کہانی بن جاتی

ہے۔ آئزک کا کمال فن ہے کہ اس نے اپنی کہانیوں کو معاشرے اور وہ بھی خالص یہودی معاشرے سے چنا ہے (لیکن موضوعی اور رزمیہ کہانیوں کو چھوڑکر) اس کی بیشتر کہانیاں اپنی تناظر وسیع کر کے مختلف معاشروں کی کہانیاں بن جاتی ہیں۔

۱۹۶۰ء میں اس کا ناول "لبلن کا ساحر" THE MAGICIAN OF LUBLIN
منڈے پریس نیویارک سے شائع ہوا، جو سرکس میں کام کرنے والے ایک بازیگر کے بارے میں ہے، لیکن اصلاً ایک روایتی یہودی اور جدید انسان کے درمیان تفاوت پہ بحث کرتا ہے۔ یہ کہانی پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصہ میں یہودیوں کے حالات کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۹۶۱ء میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ نیویارک سے زیرِ عنوان SPINOZA OF MARKET STREET شائع ہوا۔ اس کی ٹائیٹل کہانی بھی یہودی لوک تہذیب اور یہودی اسراریت پر مبنی ہے۔ سپائنوزا نے اوّلین عہد میں آئزک سنگر پر اپنے اثرات مرتسم کئے تھے۔ اس کہانی کا کردار بھی سترھویں صدی کے سکالر کا ماڈل نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں اس نے جس ہنرکاری اور پولینڈ کی یہودی برادری سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ اس نے اسے "امریکی تجربات سے متاثر ہوئے بغیر یدش کا سب سے بڑا ادیب بنا دیا ہے بلکہ یدش کا ہر دور کا بڑا ادیب بنا دیا ہے۔" [۵]

اسی ادارے کے شائع شدہ ایک اور ناول "غلام" THE SLAVE میں آئزک سنگر نے ۱۷ویں صدی کے پولینڈ کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کو انگریزی میں سیسل ہیملے نے خود آئزک کے ساتھ مل کر ترجمہ کیا۔ پال کرش سے جب ایک خاتون نے جو اس کے ساتھ کام کرتی تھی کہا کہ وہ آئزک سنگر کو ملے، تو پال کرش نے اس سے بڑی بے زاری سے کہا کہ آئزک بھی کوئی افسانہ نگار ہے۔ نسٹلجیا کا مارا ہوا۔ اب پولینڈ میں کیا ہے، جس کا

وہ رونما ہوتا ہے[16]۔ اصلاً جب آئزک سنگر کے موضوعی استغراق پر نظر دوڑائی جائے، تو
یوں لگتا ہے، جیسے اس کی فکری سوئی پولینڈ کی سرزمین پر بسنے والے یہودیوں کے مسائل
اور حالتِ زار پر اٹک سی گئی ہے۔ مشرقی یورپ کی یہودی برادری کے ساتھ اس کی وابستگی
کو منقطع ہوئے نصف صدی سے زاید عرصہ گزر گیا ہے، مگر آئزک سنگر کے قلم سے نکلنے
والے ایک ایک لفظ میں جیسے مشرقی یورپ کا سارا منظر نامہ سمٹ آیا ہے۔ غلام (۱۹۶۲ء)
کا سارا پس منظر اسی موضوعی استغراق کی نیابت کرتا ہے، کہانی نوجوان سکالر جیکب کے
گرد گھومتی ہے، جسے بعض ڈاکو گرفتار کر کے فروخت کر دیتے ہیں اور وہ غلامی کی
بدترین زندگی گزارنے لگتا ہے۔ غلامی کے دور میں وہ اپنے آقا کی بیٹی کے عشق میں مبتلا
ہو جاتا ہے اور بالآخر اپنی مقدس سرزمین پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کہانی کے بارے میں تبصروں
میں اسے کردار سازی کے حوالے سے "نہایت مؤثر" کردار کی تخلیق کہا گیا۔ ان سالوں میں

MY FATHER'S COURT - (1966)　　SHORT FRIDAY AND OTHER STORIES 1966

(۱۹۶۶ء) THE ESTATE (۱۹۶۹ء) کے علاوہ کئی دیگر
افسانے اور ناول سیسل ہیملے کے طباعتی اشاعت گھر فریرسٹراس پریس نیویارک نے
شائع کیے۔

آئزک سنگر ایک ایسا باشعور اور کمیٹڈ فنکار ہے، جس نے زندگی کے ایک
ایک لمحے کو خود بسر کیا ہے۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں زندگی کے لیے مذہب
میں آزاد لمحے کی گنجائش نہیں تھی، مگر جس طرح اس نے زندگی کو دیکھا، اپنے اردگرد کے ماحول،
اپنے لوگوں، اپنی زمین اور اپنے ملک کو زبوں حالی اور مشکلات میں محسوس کیا، یہ سارا
نظام جو معکوس چل رہا تھا، اس کے ریشے ریشے میں سما گیا۔ اسے اپنے لوگوں سے عشق تھا
اس نے ایک مذہبی ربی بننے کے مقابلے میں سیکولر بننا اس لیے پسند کیا۔ تاکہ وہ مگر

جو کمٹمنٹ اسے اپنے لوگوں کے ساتھ تھی اور اس کی روح میں رچ بس گئی تھی، اس کے قلم سے نکلنے والا ایک ایک لفظ ان کے اپنے لوگوں کی حکایت بن سکے۔ وہ یہودیوں کے لئے اپنے دل میں بہت جگہ رکھتا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ اپنے بھائی جوشیل کے بلانے پر بلگورے سے وارسا جا رہا تھا، تو اس نے ٹرین میں پولینڈ کے سپاہیوں کو یہودیوں سے زیادتی کرتے ہوئے دیکھا، وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور بعد ازاں "چھوٹا لڑکا خدا کی تلاش میں" کے ایک منظر میں وہ شدتِ جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"میں ڈبے میں ٹائلٹ کے پاس ایک کونے میں خوفزدہ کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں مسودات کا بنڈل تھا اور کچھ کتابیں۔ میں جانتا تھا کہ اب میرے سامنے انسانی تاریخ بڑی واضح ہے۔ کل روسیوں نے پولینڈ کے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا، آج پولینڈ کے لوگوں نے یہودی کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔"

آئزک جذباتی ہو جاتا ہے۔ پولش لوگوں کو کل کے آنے والے عذاب سے ڈرا رہا ہے۔ مگر آج وہ بھی خوفزدہ ہے۔ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے،

"یہ بالکل ممکن تھا کہ اگر اس وقت میرے پاس پستول ہوتا یا زہر، تو میں اپنا خاتمہ کر لیتا۔"

وہ خود بھی عذاب سے گزرا ہے، اس نے زندگی کو عبرتناک حد تک بسر کیا ہے، مگر وہ جب بھی اپنی بات کرتا ہے، اس کے سامنے ایک یہودی کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ ۱۹۲۱ء کے ان لمحات کو کبھی نہیں بھولا۔ جب وہ بلگورے سے وارسا پہنچا، تو وہ زندگی کی ہر سہولت سے محروم تھا۔ رہنے کے لئے چھت، پہننے کے لئے کپڑے اور کھانے کے لئے روٹی اسے کچھ بھی میسر نہیں تھا، مگر اس کے جذبے کی وارفتگی، فن کے ساتھ خلوص اور محنت نے

رفتہ رفتہ اسے منہاج رفعت کے جس راستے پر اسے ڈالا بے شمار دیگر انعامات کے
ساتھ دنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام بھی اس کے قدموں میں آگرا ۔ آج وہ دنیا کے
بڑے لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ آج اس کی کتاب کو دنیا کا ہر ناشر شائع کرنے پر
آمادہ ہے، مگر وہ ماضی کو یاد کر کے لطف اٹھاتا ہے۔ برسوں پہلے جب ابھی اس کا نام
اہم ادیبوں کی فہرست میں شامل نہ ہوا تھا اور اس کی تحریروں کا معاوضہ چند ڈالر ہوتا تھا
اس نے اپنے دوست راجر سٹراس سے کہا تھا کہ ایک روز اس کی آمدنی ۲۰ ہزار ڈالر سالانہ
سے بھی زیادہ ہو جائے گی، تو سٹراس نے حیرت سے آئزک کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے
محض ایک مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا تھا، جیسے وہ دن کبھی نہیں آئے گا اور وقت
نے ثابت کیا کہ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی بعض کتابیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ بکنے
والی کتابیں قرار پائیں اور اس کی آمدنی ۲۰ ہزار ڈالر سے بھی زیادہ ہوئی۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء میں اپنے ایک مضمون "اس میں میرے لیے کیا ہے" طبع HARPER
نیویارک) اپنی آمدنی کو زیرِ بحث لاتے ہوئے جو کچھ کہتا ہے، یہاں بھی ایک فرد کی جگہ
ایک یہودی نظر آتا ہے۔ وہ کئی سوال اٹھاتا اور انہیں زیرِ بحث لاتا ہے:

"ایک یدش ادیب کیسے زندہ رہ سکتا ہے، وہ اپنی زندگی کیسے بنا سکتا ہے،
اس کی کتابیں کیسے چھپتی ہیں اور کیسے پڑھی جاتی ہیں؟"

یہ وہ بنیادی سوال ہیں جو اس کے سامنے تھے۔ وہ بتاتا ہے کہ امریکہ میں جب اس کی پہلی
کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تو ناشر نے ایک ہزار کی تعداد میں کتاب چھاپ کر مجھے
صرف ۹۰ ڈالر ادا کیے تھے ۔ ۹۰ ڈالر فی جلد۔ اسی طرح ایک یدش جریدے میں
GIMPLE THE FOOL پر مجھے صرف ۲۰ ڈالر ملے اور THE FAMILY
MOSKET کی اشاعت پر ۲۵۰ ڈالر، جو اس وقت میرے لئے ایک بہت بڑی رقم

تھی۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسودات کی پروف ریڈنگ بھی اسے خود کرنی پڑتی تھی جس کا اسے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ صورت حال بہتر ہوتی رہی اور جب وہ انگریزی میں ترجمہ ہوا تو اس کی کتاب THE FAMILY MOSKET کی اشاعت پر پہلی بار دو ہزار ڈالر ادا کئے گئے۔

اس ساری صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے آئزک اکثر شکایت کرتا ہے کہ دراصل معاشرے میں لکھاری کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے، اگر کسی مصنف کا انگریزی میں ترجمہ ہوتا ہے، تو مترجم کا معاوضہ بھی مصنف کے معاوضے سے وضع کر لیا جاتا ہے۔ آئزک کو اپنی زندگی کی نصف صدی بعد تک بھی روز و شب آسودہ گزارنے کے لئے صحافت پر انحصار کرنا پڑتا اور اس کی بیوی ایلما بدستور کام کرتی رہی۔ اس نے نیو یارک آنے کے بعد آزاد صحافت تو کی تھی، مگر ابتدا ر سے ہی اسے کسی نہ کسی طور یدش " جیوش ڈیلی فارورڈ " کے صفحات میسر تھے۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی لکھتا رہا ہے، لیکن تھیٹر اس کے قریب زیادہ جگہ نہیں پا سکا۔ اس کا کہنا ہے کہ تھیٹر کسی ایک تخلیقی کوشش سے مکمل نہیں ہوتا۔ اس میں مصنف سب کچھ نہیں ہے۔ کردار، پیش کار، ہدایت کار یعنی ایک جمِ غفیر کہانی پر کام کرتا ہے، تھیٹر ایک تخلیق کار کی کلی محنت کا نتیجہ نہیں ہے مگر اس کی ناپسندیدگی بھی اسے تھیٹر کے قریب جانے سے نہ روک سکی، وہ تھیٹر کو تفریح کا بہترین ذریعہ سمجھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ تھیٹر کے تہذیبی، ثقافتی اور لوک پس منظر سے ناآشنا نہیں تھا۔ اس نے یدش تھیٹر کے لیے لکھا، نئے تجربات بھی کئے اور ایک فہیم لکھاری کی طرح تھیٹر کی تاریخ پر بھی کام کیا۔ اس نے یدش تھیٹر پر اپنے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں وہ تاریخ بیان کرتے ہوئے ماضی کو یاد کرتا ہے کہ " ایک وقت تھا جب سیکنڈ ریونیو تھیٹر سے آباد تھا۔ "[۱۷] نیو یارک ٹائمز منڈے ریڈنیس ۱۴ اپریل۔

۱۹۶۶ء۔ اس مضمون میں اس نے یدش کی جڑیں ایک عہدی قبل یدش تھیٹر میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ یدش تھیٹر کی مقبولیت کے بارے میں کہتا ہے کہ "جب تھیٹر کا ایک بہت بڑا نام ابراہام گولڈفیڈن فوت ہوا تو اس کے جنازے میں ۷۵ ہزار افراد شریک تھے" مگر اب" آئزک افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ" نیویارک سے یہودی تھیٹر آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے اور جہاں کبھی ۲۰ تھیٹر تھے، اب وہاں چند دم توڑتے ہوئے تھیٹر نظر آتے ہیں۔" آئزک کا خیال ہے کہ تھیٹر کی نامقبولیت کی وجہ یدش زبان سے نئی نسل کی بغاوت ہے۔ اب آنے والی نسل زیادہ تر انگریزی پر توجہ دے رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ افسانہ، ناول، شاعری اور ایک حد تک تنقید اب بھی یدش میں نظر آرہی ہے، مگر اب تھیٹر بالکل ختم ہو رہا ہے۔

آج آئزک کے پاس بے شمار دولت ہے اس نے اپنے بنک کی اکاؤنٹ کی دیکھ بھال کے لئے ایک اکاؤنٹنٹ رکھ لیا ہے، مگر بقول اس کے اب بھی اس کی زندگی کی معمولات میں اور اس کی اندرونِ ذات کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب اسے ۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو فلوریڈا کے ساحل کے کنارے نوبیل کی خبر ملی اور یہ بھی بتایا گیا کہ اسے تقریباً ۱۲ لاکھ روپے نقد بھی ملیں گے، تو اس کا تاثر تھا کہ میں اس رقم کو یقیناً قبول کرلوں گا مگر ساری اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اس میں ان لوگوں کا حصہ بھی نکالوں گا جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہیں، وارسا کے خوف میں لتھڑی ہوئی گلیوں میں بے روزگار اور بھوکے نوجوان آئزک سنگر سے لے کر دنیا کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ یافتہ آئزک سنگر تک اس کے فکری فلک الافلاک پر کوئی ایسی تبدیلی رونما نہیں ہوئی جسے اس کے فن میں نشیب کے حوالے سے سمجھا جاسکے، دولت میں مسلسل اضافے نے اس کے فن کو رفعت میں بھی اضافہ کیا۔

آئزک بیشوز سنگر کا نظریہ فنِ زندگی کے مختلف مراحل میں گو کسی بڑے متبدل یا دیر

میں نظر نہیں آتا، مگر طویل ادبی زندگی کے حوالے سے سوچ کی کڑیاں مختلف انداز میں اس کے ذہنی ارتقا کی دلیل ضرور پیش کرتی ہے۔ آئزک سنگر ایک کٹر مذہبی اور عالم یہودی کے گھرانے میں پیدا ہوا جہاں کا سارا نظام حیات مذہبی عبادات، مذہبی قصہ گوئی، مذہبی دیومالا اور مذہبی لوک ورثہ سے عبارت تھا، چنانچہ اس کا ذہنی سفر بھی ایک مذہبی اور شدید مذہبی جکڑبندیوں سے آغاز پایا۔ ابھی چھوٹا تھا، تو انسان اور خاص طور پر اس کے اپنے اردگرد بسنے والوں انسانوں کی بے توقیری نے اس کے ذہن میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دیں۔ انصاف کے لئے، ضروریاتِ زندگی کے لئے ترستے ہوئے اور مسلسل کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہوئے لوگوں سے ناانصافی کے حوالے نے اُسے خدا اور انسان کے مابین رشتے پر از سرِ نو غور پر مجبور کیا۔ یہاں سے اس کے ذہن میں یہودی کے مذہبی عقائد کے اعتبار سے ترتیب پانے والے خدا کے بارے میں شک پیدا ہوا اور اس نے خدا اور انسان کے درمیان رشتوں کی کمزور کڑی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ "کچھ لوگ غریب اور کچھ دولت مند کیوں ہیں؟ کائنات سے قبل کیا تھا؟ کیا ایک بکری کی بھی روح ہوتی ہے؟ کیا (حضرت) آدم بھی ایک یہودی تھے"؟[۱۱]

۱۹۷۵ء میں "دی سکوائر" کے ایک شمارے میں خدا، کائنات اور انسان" کے حوالے سے ایک سوال آئزک اور یوجین لونیسکو سے پوچھا گیا۔ لونیسکو کا جواب نفی میں تھا اور آئزک کا اثبات میں۔

آئزک کی بہت سی کہانیوں کو یدش اور انگریزی تھیٹر میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامائی تشکیل بھی دی گئی۔ اس کے ایک سکرپٹ KNIGHTMARE AND PUPKO'S BEARD پر آدھے گھنٹے کی فلم بھی بنی جسے امریکی فلم فیسٹول میں ایوارڈ ملا۔ ۱۹۸۲ء میں ییل ریپرٹری تھیٹر YELE REPERTERY THEATER نیویارک

نے اس کے ایک کھیل MIRROR کو پیش کیا۔ یہ اصلاً ایک عشقیہ داستان تھی اور "نیو ورلڈ رائٹنگ" NEW WORLD WRITING میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی معروف کہانیوں کو تھیٹر میں پیش کیا گیا۔ اس کی مشہور کہانی GIMPLE THE FOOL میں ہالی وڈ کے کئی مشہور اداکاروں نے کام کیا جن میں رچرڈ ونجر، نکولس ہرمن اور مارشیا جین کرٹ قابل ذکر ہیں۔

آئزک کو یدش سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ گو اس کی شہرت انگریزی کے طفیل ہوئی، مگر وہ اب بھی یدش ادیب کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں انعام حاصل کرنے سے قبل ایک انٹرویو میں وہ کہتا ہے کہ کئی سال پہلے میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا پبلشر مل جائے جو میری کہانیوں کو یدش میں شائع کرے اور ایسا ہوا، آج آئزک کے ارد گرد بے شمار ایسے ناشر موجود ہیں، جو اس کی کہانیوں کو انگریزی اور یدش میں شائع کرتے ہیں اور دنیا کے بیشتر ممالک میں آئزک کا ترجمہ ہو رہا ہے اور بے شمار دولت کا مالک ہے، مگر اس کا کہنا ہے کہ دولت کی فراوانی نے اس کی عادات خراب نہیں کیں، بلکہ چیزوں کے ساتھ، انسانوں کے ساتھ اس کا رشتہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے، جیسے بھوک اور مفلسی کی صورت تھی۔"

"وہ اپنی زندگی کے حالات بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں بس اتنا فرق آیا کہ میں نے سمندر کے کنارے ایک گھر لیا ہے، گرمیوں میں سوئیٹزرلینڈ اور سال میں ایک بار اسرائیل جاتا ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ بنکوں میں پڑے ڈالروں نے اس کے معمولات پر زیادہ اثر نہیں ڈالا اور اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو وہ زندگی اسی طرح بسر کر رہا ہوتا۔" "دی سکوائر" میں اٹھائے گئے سوال کے جواب میں جو مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں آئزک نے زندگی اور زندگی سے متعلق دائمی قدروں کے حوالے سے بہت سے سوال اٹھائے

اور اس نے وہ تمام مباحث / گفتگو کو زیر بحث لانے کی کوشش کی جو وہ اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اس کا باپ ایک کٹر مذہبی ربی تھا اور بھائی نے روس جانے کے بعد کمیونسٹ خیالات کو اپنانے کی کوشش کی تھی، وہ اپنے گھر میں یہ سوال اٹھایا کرتا تھا کہ کیا کوئی ایسی ہستی ہے جس نے کائنات تخلیق کی؟ سب سے زیادہ زیر بحث آنے والا سوال دائمی اقدار کا تھا۔ کائناتی معاملہ محض نظریاتی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ کائنات جس طرح مجھ پر عیاں تھی، (وہ میرے گھریلو ماحول کے حوالے سے) وہ عقلی نہ تھی مگر میرے خیال کے مطابق ساری کائنات ایک خدائے بسیط تھی، تاہم خود یہ سوال بھی اہم تھا کہ کیا عقلیت کی اپنی بھی کوئی VALIDITY ہے۔

میں افسردہ نوجوان اور فریب نظر کا مریض ہوں۔ میں نے زندگی میں حیران کر دینے والے واقعات، بھوکے بچے، گندے بھکاری، گلیوں میں ننگی زمین پر سوئے ہوئے بے گھر لوگ اور گاڑیوں میں دندناتے ہوئے سپاہی دیکھے ہیں، جو خدا کے لئے کوئی خوش کن صورت پیدا نہیں کرتے۔ چوہے کو گھورتی ہوئی بلی بھی مجھے دکھی اور باغی بنا دیتی ہے۔ میرے نزدیک نہ تو انسانی استدلال میں بھی سچائی ہے اور نہ ہی عقیدے کے مطابق "خدا کے قریب رحم" کا وجود لازمی دکھائی دیتا ہے، میں نے دونوں میں تضاد پایا ہے۔ اس کے ذہن میں معاشرتی تجربات نے تشکیک کو ابھارا اور اس میں عقیدے سے متعلق کتنے ہی سوال گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔

I HAVE NO CLEAR IDEA OF THE AIM AND EXPECTATION OF GOD ۲۳

آئزک ایک دور میں سپائنوزا کے نظریات سے بری طرح متاثر تھا، مگر وقت اور تجربے نے اسے سپائنوزا کے نظریات سے دور کر دیا اور ایک دن اس نے اعلان کیا

اور اس نے وہ تمام مباحث / گفتگو کو زیرِ بحث لانے کی کوشش کی جو وہ اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اس کا باپ ایک کٹر مذہبی ربی تھا اور بھائی نے روس جانے کے بعد کمیونسٹ خیالات کو اپنانے کی کوشش کی تھی' وہ اپنے گھر میں یہ سوال اٹھایا کرتا تھا کہ کیا کوئی ایسی ہستی ہے جس نے کائنات تخلیق کی؟ سب سے زیادہ زیرِ بحث آنے والا سوال دائمی اقدار کا تھا۔ کائناتی معمہ محض نظریاتی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ کائنات جس طرح مجھ پر عیاں تھی' (وہ میرے گھریلو ماحول کے حوالے سے) وہ عقلی نہ تھی مگر میرے خیال کے مطابق ساری کائنات ایک خدائے بسیط تھی، تاہم خود یہ سوال بھی اہم تھا کہ کیا عقلیت کی اپنی بھی کوئی VALIDITY ہے۔

میں افسردہ نوجوان اور قریب نظر کا مریض ہوں۔ میں نے زندگی میں حیران کر دینے والے واقعات، بھوکے بچے، گندے بھکاری، گلیوں میں ننگی زمین پر سوئے ہوئے بے گھر لوگ اور گاڑیوں میں دندناتے ہوئے سپاہی دیکھے ہیں' جو خدا کے لئے کوئی خوش کن صورت پیدا نہیں کرتے۔ چوہے کو گھورتی ہوئی بلی بھی مجھے دکھی اور باغی بنا دیتی ہے۔ میرے نزدیک نہ تو انسانی استدلال میں بھی سچائی ہے اور نہ ہی عقیدے کے مطابق "خدا کے قریب رحم" کا وجود لازمی دکھائی دیتا ہے' میں نے دونوں میں تضاد پایا ہے۔ اس کے ذہن میں معاشرتی تجربات نے تشکیک کو ابھارا اور اس میں عقیدے سے متعلق کتنے ہی سوال گڈمڈ ہو کر رہ گئے[۲۳]

[۲۳] I HAVE NO CLEAR IDEA OF THE AIM AND EXPECTATION OF GOD

آئزک ایک دور میں سپائنوزا کے نظریات سے بری طرح متاثر تھا، مگر وقت اور تجربے نے اسے سپائنوزا کے نظریات سے دور کر دیا اور ایک دن اس نے اعلان کیا

کرسپائنوزا کا خدا اس کا خدا نہیں ہے۔ وہ خود کو اپنے انداز میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ خدا کسی تخیل کی پیداوار نہیں ہے۔

HE IS NOT A PREPECTUALLY WOUND UP CLOCK, BUT CREATIVE DYNAMIC, FULL OF WISDOM AND NOT CRUEL. ۲۹

آئزک بشو زا اپنی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرا، عقیدے اور لادینیت کے مابین فرق پر ساری زندگی غور کرتا رہا۔ مختلف نظریات سے متاثر ہوتا، اس کی تردید کرکے آگے بڑھتا رہا۔ آئزک نے انسان اور خدا کے مابین رشتوں کو بچپن سے دیکھنے اور سمجھنے کا آغاز کیا تھا، اس کے ذہن میں اس کے بھائی اسرائیل جوشوا سنگر کی زندگی کے وہ اثرات بھی تھے جس نے خاندان میں قدیم روایات کو توڑنے کا حوصلہ پیدا کیا اور ایک کمیونسٹ کی حقیقت سے روس میں ابتدائی زندگی کے دن گزارے مگر اس کے ذہن میں نسلی تعصبات کی طرح یہ بات بھی ہمیشہ موجود رہی کہ کائنات کو چلانے والی ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے، جو اسے ایک ترتیب دیتی ہے اور لاشعور کے کسی گمنام گوشے میں موجود اس کا انتہائی اظہار ۲۶ رنومبر ۱۹۷۸ء کو اس وقت ہوا جب مینٹین میں ربی ولیم بارکورز نے خدا پر عقیدے کے حوالے سے سوال کیا کہ کیا وہ خدا پر یقین رکھتا ہے اور پہلے کیا منکر تھا۔ آئزک نے کہا کہ وہ خدا پر دوبارہ ایمان لے آیا ہے۔ خدا سے انکار اس کی زندگی کی بدترین غلطی تھی۔

آئزک ایک یہودی کہانی کار ہے جو یہودی تاریخ اور وقت کے دائرے میں قید ہے مگر وہ خود اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہانی کبھی وقت کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ہومر کے ناول اوڈیسی کو زبان و مکان سے آزاد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہومر کہانی میں نفسیاتی اور فلسفیانہ موشگافیوں کی وضاحت میں الجھ جاتا تو اس

کی کہانی وقت کے دائرے میں اس طرح قید ہو جاتی جس طرح آئرس مکسلے کی کہانی COUNTER POINT میں مصنف فرائڈ کے نکتۂ نظر کو کھو بیٹھے ہوئے کہانی کو لامحدود ہونے سے روکنے کا سبب بن گیا، اور کہانی وقت کے دائرے میں مقید ہو گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ کہانی وضاحت کی متقاضی نہیں ہوتی، اگر کہانی میں وضاحت آجائے تو وہ زمان و مکان سے نکلنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے۔

جذباتی انداز حیات کے بارے میں اس کا نکتۂ نظر خالص انسانی جبلی عادات پر مبنی ہے۔ وہ سائکوزا کے اس خیال سے قطعی اختلاف رکھتا ہے کہ جو مرد یا عورت محبت کے جذبات کی اسیر ہو جائے وہ مخبوط الحواس ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ انسانی جذبات بیشتر غلط راہ پر نہیں جاتے۔ اس کا خیال ہے انسانی جذبات واحساسات کے حوالے سے سپائنوزا کی بات رد ہو جاتی ہے۔ محبت تو ایک نہایت بالیدہ خیال ہے اور یہی مثال فن پر بھی صادق آتی ہے۔ فن بھی بالیدہ جذبات کا نام ہے۔ آئزک اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ فن کی بنیاد احساسات و جذبات پر ہے، استدلال پر نہیں اور وہ استدلال کو فن کے لئے ضروری خیال نہیں کرتا۔ استدلال اور منطق سائنس کے مضامین ہیں فن کے نہیں۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کے کرداروں میں فطری محرکات اور عقیدے کی پُراسراریت، جبلت اور ضمیر کے مابین ایک شدید کشمکش موجود ہے اور اس کے کردار اس تضاد اور کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر ایسا نہیں کرتا تاہم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ارشادات فطری ہیجانات کو روکنے کا درس دیتے ہیں۔

ایک بار ایک لیکچر کے دوران جب ان سے سوال کیا گیا کہ ایذرا پاؤنڈ، جیمس جائس بطور ادیب، پیرو بطور آرٹسٹ اور شونبرگ بحیثیت موسیقار اس مقصد کے حصول کے لئے قدرے پیچیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں، تو آئزک نے جواب

دیا کر" فن کو سمجھنے کے لئے کسی ڈکشنری کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"[26] آئزک کی یہ دلیل اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کا نظریہ فن اس کی اپنی پیش گوئی سے ابھرتا ہے جس کی جڑیں خود اس کے فن میں گڑی ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے :

ایک کہانی وضاحت کی قطعی متقاضی نہیں ہوتی۔ ابہام ایک الگ چیز ہے اور دھندلاہٹ (اخفایت) دوسری۔

وہ اس چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ لوگ بے مقصد کہانی کے ساتھ گھومتے رہیں۔ جب اس سوال کو مزید وضاحت کے لئے پیش کیا گیا کہ ممکن ہے کسی ایک کا مزاج ایک خاص طرز پر فروغ پا گیا ہو، مثلاً ایذرا پاؤنڈ کا فن، یا تجریدی موسیقی یا مصوری۔ آئزک کا جواب تھا کہ لوگ کسی بھی چیز کے عادی ہو سکتے ہیں اس کے لئے فن ہی کیوں ضروری ہے۔ میرا ایک کیمونسٹ دوست جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب وہ کئی سال جیل کاٹ کر آیا، تو اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ذات جیل میں ہی چھوڑ آیا ہے۔

آئزک کے فن کے حوالے سے اکثر بیشتر اسے یہودی لوک ورثے کا فن کار کہا گیا ہے۔ آئزک کا کہنا ہے کہ وہ لوک ورثے کے بارے میں جو محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہر دور اور ہر نسل میں صرف چند جوہر قابل پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کی تخلیق میں ایک اجتماعی جوہر قابل بھی ہوتا ہے اور یہی اجتماعی جوہر قابل لوک ورثہ تخلیق کرتا ہے۔ جس طرح آپ شہد کی مکھیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح اجتماعی کام میں مصروف نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح پورا عصر اس کا حصہ دار ہوتا ہے اور اس اجتماعی کاوش اور تخلیق کے سبب لوگ اپنے اپنے لوک ورثے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ ہم لوگ محدودیت کا شکار ہیں، نہ صرف حکومتوں میں بلکہ ذہنی استعداد میں بھی۔ اور قانونِ قدرت کے حساب سے بھی۔ وہ کہتا ہے جب آپ کہیں سے گزر رہے ہوں، تو آپ لوگوں کی نظروں سے

پوشیدہ نہیں ہوتے، اگر آپ کے پر نہیں ہیں تو آپ اڑ نہیں سکتے۔ مگر لوک ادب میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ بھرے بازاروں میں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔ بغیر پروں کے فضا میں اُڑ سکتے ہیں، سیکنڈوں میں میلوں کی مسافت طے کر سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ انسانی جذبات کے لئے تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ذہن کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتا مگر یہ صرف ہمارے احساسات کے لئے کام کرتا ہے۔ جہاں تک میرا مسئلہ ہے' آئزک کہتا ہے میں اپنے مذہبی سرمائے یدش کے لوک ورثے سے کسب فیض کرتا ہوں اور یہ سب کچھ میں نے بچپن میں اپنے گھر میں سُن رکھا تھا۔

آئزک کے فن پر یہودی مذہب پرستوں کی طرف سے یہ الزام مسلسل عائد کیا جاتا رہا ہے کہ اس کے فن میں عریانیت اور اختلاط کے مناظر اسے بڑا فن کار نہیں بننے دیتے۔ اس کے نقادوں کا کہنا ہے کہ آئزک کا فن" انسان دوستی اور عقلیت پسندی کے مسائل پر بحث تو کرتا ہے، تاہم سماجی برائیوں کے جو مختلف اثرات ایک ساتھ سفر کرتے ہیں وہ ایک شریف یہودی ماں کو گھر میں آسودہ نہیں رہنے دیتے اور یدش قاری کو یہ چیزیں بے چین کر دیتی ہیں اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان میں اور آئزک کے درمیان روحانی فاصلہ حائل ہے۔

آئزک کی فنی اور شخصی زندگی مسیحی کیلنڈر کے ساتھ ساتھ صدی کی آخری چوتھائی طے کر رہی ہے۔ اس نے اب تک ۱۴ ناول ۱۲ کہانیوں کے مجموعے، ۵ یاداشتوں کی کتب ۱۴، بچوں کی کتابیں ۸، ترجمہ کتب، سینکڑوں تبصرے، مقالات اور مضامین تحریر کیے ہیں، جن کا احاطہ کسی ایک مضمون میں ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا، مگر یہودیوں کی ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی تاریخ اس میں جذب ہے۔ ہزارہا روحیں اس میں سما گئی ہیں۔ وہ واقعتاً عصرِ حاضر کا ایک بڑا لکھاری ہے، جس نے عصرِ حاضر سے دورِ ماضی میں پھیلی ہوئی

ایک قوم کی تاریخ کو ادب کی تمام تر باریکیوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔" وہ یدش کا ہاتھوان ہے۔" اس نے افسانے اور ناول میں اپنے لئے ایک بڑا لینڈ سکیپ منتخب کیا تھا مگر پورے لینڈ سکیپ کو پوری توانائی اور روشن عکس بین کی طرح متنوع کیا۔ اس کی فینٹسی اور حقیقت نگاری دونوں" ایک سکے کے دو اطراف ہیں۔ دنیا اسے ایک طرف سے دیکھے یا دوسری طرف سے۔"

آئزک کی تخلیق میں جو دو فکری لہریں ایک ساتھ چلتی ہیں، فنی اعتبار سے اس کی تخلیقات کو واضح طور پر دو الگ الگ علامات میں شناخت کراتی ہے۔ آئزک کا ایک معروف نقاد ارونگ میلن اس کو دو واضح خانوں میں بانٹتا ہے۔ محدود زاویۂ نظر کے CLOSED NOVELS یعنی مذہبی اور نسلی تناظر میں تحریر ناول جیسے غلام"۔ "لبلن کا جادوگر"۔ "گورے میں شیطان" وغیرہ اور کھلے ناول یعنی وسیع تناظر رکھنے والے جیسے فیملی موسکٹ، دی مدر، دی اسٹیٹ وغیرہ۔

یوں تو آئزک" شخص وعکس" پر بے شمار نقادوں نے اب تک لکھا ہے اور اس کے فن اور شخصیت کے ہر ہر پہلو پر طبع آزمائی کی ہے مگر طویل اور مکمل طور پر آئزک کی شخصیت اور فن کی تصویر ارونگ بوہن ERVING EUCHEN کی کتاب آئزک بشوز سنگر اور اس کا لایزل ماضی" میں مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ذات و فن کو ایک دوسرے کے عکس میں دیکھتا ہے۔

وہ آئزک کے فن میں ایسی بے شمار علامات تلاش کرتا ہے جو یہودیوں پر ٹوٹنے والے عذاب کو تاریخ کے طویل تناظر میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ آئزک سنگر ایک خوش نصیب فنکار ہے جسے بہت سے نقادوں نے تاریخ ادب کے بڑے ناموں کے ساتھ لا کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے، کسی نے اسے ڈکنز، ریڈ گر جیمس، لوڈن، گوگول، دانتے کے ساتھ بریکٹ

کیا، توکسی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، ایڈگرایلن پو اور ماہم کی صف دی۔ بہرحال اپنی زندگی میں شہرت کی اس منہاج رفعت پر نظر آنے والا وہ واحد کہانی کار ہے جس کے بارے میں بلاجھجک کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ عہد میں یکتائے روزگار یہودی کہانی کار ہے۔

۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۸ء جمعرات کی صبح جب آئزک اپنی زندگی کے پچھترویں سال کی مسافت طے کرتا ہوا فلوریڈا کے ساحل پر اپنے اپارٹمنٹ سے ناشتے کی غرض سے ہوٹل جانے کے لیے باہر نکلا اور اپارٹمنٹ سے باہر کھڑا اپنی ۲۵ سال سے رفیقِ حیات ایلما سنگر کا انتظار کرنے لگا، جو ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر دروازے سے واپس چلی گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب ایلما واپس آئے گی، تو وہ دنیا کے عظیم انسانوں کی فہرست میں شامل ہو چکا ہوگا۔ وہ ایلما کے انتظار میں بار بار دروازے کی طرف دیکھتا، جو بدستور بند تھا۔ ٹیلی فون کال طویل ہوگئی تھی، وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ بالآخر دروازہ کھلا اور ایلما تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ آئزک نے اس کے چہرے پر جذبات کا ایک ہجوم دیکھا۔ اسے ایلما کی حالت پر حیرت تھی۔

"کیا بات تھی، اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

اسی اثنا میں ایلما اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔

"بہت دور سے ٹیلی فون آیا تھا — سویڈن سے"۔

اس نے آئزک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ آئزک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہیں نوبیل پرائز کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے"۔

آئزک کے چہرے پر حیرانی تھی — صرف حیرانی

"کیا تمہیں یقین ہے یہ خبر درست ہے؟ یقیناً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

یقیناً نوبیل پرائز کے لئے ناموں کو کنفیوز کر رہے ہوں گے۔"
وہ خاموش ہو گیا اور پھر چند ساعتوں کے بعد خود ہی کہنے لگا۔
"بہرحال کچھ بھی ہو، چلو ہمیں ناشتہ کرنا چاہیئے اس خوشی کے لئے ہم ناشتہ تو نہیں چھوڑ سکتے۔"
اس نے ایلما کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور آہستہ آہستہ ہوٹل کی طرف چلنے لگے، جہاں ایک عام کہانی کا رائٹر کے بشنوز سنگر کی بجائے دنیا کے ادبی نوبیل پرائز ونر کی مخصوص میزبان کا انتظار کر رہی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ سٹریٹ ۸۶ کا ساحر — THE MAGICIAN OF STREET 86 BY KRESH PAUL.
از پال کرش صفحہ ۷ — THE DIAL PRESS N. W. 1979.

۲۔ یدش YIDDISH مشرقی یورپ خصوصاً جرمنی اور پولینڈ میں آباد یہودیوں کی ادبی زبان۔ ابتدا میں یہاں عبرانی میں ہی ادب تخلیق کیا جاتا رہا۔ مگر بعد ازاں عبرانی کو مذہبی مقاصد اور یدش کو ادب اور عام زندگی میں فوقیت حاصل ہو گئی۔ گزشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے آغاز خاص طور پر جنگ عظیم اوّل کے ارد گرد بہت بڑی تعداد میں جب یہودیوں نے امریکہ کی طرف نقل مکانی کی تو امریکہ میں یدش ادب اور ڈرامے کو بڑی شہرت ملی اور ایک بہت بڑا حلقہ اس زبان کا امریکہ میں موجود ہے۔ یدش تھیٹر ۱۸۷۶ء میں ابراہام گولڈفیڈن نے قائم کیا۔ جبکہ روس میں انیسویں صدی کے وسط میں یدش تھیٹر موجود تھا، مگر شدید مذہبی تنگ نظری کے سبب ۱۸۸۳ء میں یہاں پابندی عائد کر دی گئی جسے بعد ازاں ۱۹۰۸ء میں اٹھا لیا گیا۔ امریکہ میں کئی یدش جریدے شائع ہوتے ہیں۔ گو یہودیوں کی نئی نسل انگریزی کے زیادہ قریب ہو گئی ہے، مگر اب بھی یدش حلقہ بہت مضبوط ہے جو زندگی کے تمام طبقوں پر محیط ہے۔

۳۔ سٹریٹ ۸۶ رکا ساحر
۴۔ اروِنگ میلن، آئزک بشیوز سنگر، نیویارک یونیورسٹی پریس نیویارک ۱۹۶۸ر
۵۔ یہودی عالم استاد
۶۔ سٹریٹ ۸۶ رکا ساحر
۷۔ ایضاً
BUCHEN IRVING H.

ISSAC BASHAVIS SINGER AND THE ETERNAL PAST

۹۔ الماں رچرڈ

THE SINGER OF WARSA THE NEW YORK MIME REVIEW MAY 6 P-1

۱۰۔ سٹریٹ ۸۶ کا ساحر
۱۱۔ ایضاً ۔صفحہ ۸۶
۱۲۔ ملن اروِنگ صفحہ ۸۷
۱۳ ایضاً
۱۴۔ سٹریٹ ۸۶ کا ساحر۔
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ آئزک بشوز سنگر، نیویارک ٹائمز (سنڈے ایڈیشن) ۱۴ راپریل ۶۶ رصفحہ ۱۹ ۔
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ آئزک بشوز سنگر۔ دی اسٹیٹ (ناول)
۱۹۔ سٹریٹ ۸۶ رکا ساحر۔
۲۰۔ نومبر ۱۹۷۵ رکے آواخر میں YMHA ۹۲ سٹریٹ نیویارک میں لیکچر سے اقتباس۔

۲۱۔ نومبر ۱۹۷۵ء کے اواخر میں YMHA ۹۲ سٹریٹ نیویارک میں لیکچر سے اقتباس

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ سٹریٹ ۸۶ کا ساحر۔ صفحہ ۱۷

۲۴۔ ایضاً "

۲۵۔ سٹریٹ ۸۶ کا ساحر۔ صفحہ ۱۷

۲۶۔ ایضاً

Issac Shoes

Bibliography

Fiction

Shoten an Goray (Satan in Goray) Warsaw: P.F.N. Club. 1935.

Di Familie Mushkat (The Family Moskat). New York: Morris S. Sklarsky, 1950.

The Family Moskat. Translated by A. H. Gross. New York: Alfred A. Knopf, 1950.

Satan in Goray. Translated by Jacob Sloan. New York: Noonday Press, 1955.

The Magician of Lublin. Translated by Elaine Gottlieb and Joseph Singer. New York: Noonday Press, 1960.

The Slave. Translated by the author and Cecil Hemley. New York: Farrar, Straus and Cudahy, 1962.

The Manor. Translated by Joseph Singer and Elaine Gottlieb, New York: Farrar, Straus and Goux, 1967.

The Estate. Translated by Joseph Singer, Elaine Gottlieb, and Elizabeth Shub. New York: Farrar, Straus and Girou, 1969.

Enemies. A Love Story. Translated by Aliza Shevrin and Elizabeth Shub. Farrar, Straus and Giroux, 1972.

Shosha. Translated by Joseph Singer and the author. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1978.

Yarme and Kayle. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1979.

Unpublished Novels

Shadows on the Hudson (serialized in the *Jewish Daily Forward*, 1957).

A Ship to America (serialized in the *Jewish Daily Forward*, 1974).

Collections of Short Stories

Shoten an Goray un Anderer Dertailungen (Satan in Goray and Other Stories). New York: Farlag Matones, 1945.

Gimpel the Fool and Other Stories. Translated by Saul Bellow, Isaac Rosenfield, and others. New York: Noonday Press, 1957.

The Spinoza of Market Street. Translated by Martha Glicklich, Cecil Hemley, and others. New York: Farrar, Straus and Cudahy, 1961.

Gimpel Tamun Anderer Dertailungen (Gimple the Fool and Other Stories. New York: Central Yiddish Culture Organization, 1963.

Short Friday and Other Stories. Translated by Joseph Singer, Roger H. Klein, and others. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1964.

Selected Short Stories of Isaac Bashevis Singer. Edited and introduced by Irving Howe. New York: The Modern Librry, 1966.

The Seance and Other Stories. Translated by Roger H. Klein, Cecil Hemley, and others. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1968.

A Friend of Kafka and Other Stories. Translated by the author, Elizabeth Shub, and others. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1970.

An Isaac Bashevis Singer Reader. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1971.

A Crown of Feathers and Other Stories. Translated by the author, Laurie Colwin, and others. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1973.

Passions and Other Stories. New York: Farrar. Straus and Giroux.1975.

Old Love. New York: Farrar. Straus and Giroux. 1979.

Memoirs

Main Tatn's Beth-Din Shtub (My Father's Beth-Din Court). New York: Kval Publishers 1956.

In My Father's Court. Translated by Channah Kleinerman Goldstein. Elaine Goulich. and Joseph Singer. New York: Farrar. Straus and Giroux. 1966.

Isaac Bashevis Singe and Ira Moskowiz. *A Little Boy in Search of God. or Mysticism in a Personal Light*. Garden City. New York: Doubleday. 1976.

A Young Man in Search of Love. Illustrated by Rephael Soyer: Garden City. New York: Doubleday. 1978.

Lost in America. Illustrated by Raphael Soyer: Garden City. New York: Doubleday. 1979.

Children's Stories.

Zlateh the Goat and Other Stories. Translated by Elizabeth Shub and the author. Illustrated by Maurice Sendak. New York: Harper and Row. 1966.

The Fearsome Inn. Translated by Elizabeth Shub and the author. Illustrated by Nanacy Hogrogianne. New York: Scriber's 1967.

Mazel and Shlimaze; or The Milk of a Lioness. Translated by Elizabeth Shuh and the author. Illustrated by Margot Zemach. New York: Farrar. Straus and Giroux. 1967.

Elijah the Slave. Illustrated by Antonio Fiasconi. New York: Farrar. Straus and Giroux. 1970.

Joseph and Kozaor The Sacrifice to the Vistula. Translated by the authori and Elizabeth Shuh. Illustrated by Symeon Shimin; New York: Farrar, Straus and Giroux. 1970.

Alone in the Wild Forest. Translated by the author and Elizabeth Shuh. Ilustrated by Mugel Zemach. New York: Farrar. Straus and Giroux, 1971.

The Topsy-Turvy Emperor of China. Translated by the author and Elizabeth Shuh. Illustrated by William Pene du Bois. New York: Harper and Row. 1971.

The Wicked City. Translated by the author and Elizabeth Shuh. Illustrated by Lenard Everell Fisher. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1972.

The Fools of Chelm and Their History. Translated by the author and Elizabeth Shuh. Illustrated by Uri Shulevitz. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1973.

Why Noah Chose by Dove. Translated by Elizabeth Shuh. Illustrated by Eric Carle. New York: Farrar, Straus and Giroux. 1974.

A Tale of Three Wishes. Illustrated by Irene Leiblich. New York: Farrar, Straus and Giroux. 1976.

Naftali the Storyteller and His Horse, Sus, and Other Stories. Translated by Joseph Singer. ruth Schachner Finkel, and the author. Illustrated by Margot Zemach. New York: Farrar. Straus and Giroux, 1976.

Eight Hannukah Storis. New York: Farrar, Straus and Giroux, 1979.

Translations

Stefan Zweig. *Romain Rolland*. Vilna: B. Kletzkian, 1927.

Knut Hamsun. *Die Vogler*. Vilna: B. Kletzkian, 1928.

Knut Hamsun. *Victoria*. Vilna: B. Kletzkian, 1929.

Erich Remarque. *All Quiet on the Western Front*. Vilna. B. Kletzkian, 1931.

Thomas Mann. *The Magic Mountain*. Vilna: B. Kletzkian, 1932.

Leon Glaser. *From Mascow to Jerusalem*. New York: Max Kanbowitzv, 1938.

Essays and Reviews

"The Everlasting Joke," *Commentary*, 31 (May 1961): 458-60.
"The Poetry of Faith," *Commentary*, 32 (September 1961): 258-60.

"A New Use for Yiddish," *Commentary*, 33 (March 1962): 267-69.
"Realism and Truth." Translated by Adaberbach Lapin. *The Reconstructionist*. 15 (June 1962): 5-9.
"Why I write in Yiddish." *Pioneer Woman*, 38 (January 1963): 13.
"What It Takes to Be a Jewish Writer." Translated by Mirra Ginsburg. *National Jewish Monthly*. 78 (November 1963): 54-56.
"Sholom Aleichem: Spokesman for a People." *The New York Times*, 20 (September 1964). Section 2 pp. 1,4.
Introduction to *Yoshe Kalb*, by I.J. Singer. New York: Harper and Row, 1965.
"Rootless Mysticism." *Commentary*, 39 (January 1965): 78-79.
"Indecent Language and Sex in Literature," Translated by Mirra Ginsburg. *Jewish Heritage*. 8 (Summer 1965): 51-54.
"The Ten Commandments and the Modern Critics." *Cavalier*, June 1965, p.30.
"A Phantom of Delight," *Book Week*, 4 July 1965. pp 2,7.
"What's in It for Me," Harper's, 231 (October 1965): 166-67.
[Review of *Pan*, by Knut Hamsnu] *Holiday*, 38 (December 1965): 166-67.
"Peretz's Dream." American Judaism, Spring 1966, pp.20-21, 60-61.
"Once on Second Avenue There Lived a Yiddish Theater, *The New York Times*, 17 April 1966, Section 2, p.3.
"Kafka's Trials," *Book Week*, 1 May 1966, pp. 16-17.
"Hagigah," *American Judaism*, Winter 1966-67, pp. 18-19, 48-49.

(

.e Future of Yiddish and Yiddish Literature," *The Jewish Book Annual*, Vol. XXV, New York: Jewish Book Council of America, 1967, pp. 70-74.

"The Extreme Jews" *Harper's*, 234 (April 1967), 55-62/

"Civilising the Shtetl," *Jewish Chronicle*, 8 December, 1967 pp.

Introduction to Adventures of One Yitzchok Perlou, New York: Award Book, 1967.

Introduction to *Hunger* by Knu Hamton, New York: Press, 1968.

"The Writer of Inborn Goodness" *Book World*, 17 March, 1968, p. 4.

"Editor's Prize," *Playboy*, 15 (May 1968) 18.

"The Fable as Literary Form," Introduction to *Aesop's Fables*, Translated by George, Townsend, Garden City, N.Y. Doubleday, 1968.

"Roth and Singer on Bruno Schulz, *The New York Times Books Review* 13 February 1977, pp. 5, 14,16,20.

Nobel Lecture, New York: Farrar, Straus and Giroux, 1979, (English and Yiddish).

Uncollected Short Stories

"Hail, the Messiah," [Translated by Morris Kreitman Maurice Carr] *Jewish Stories of Today*. Edited by Morris Kreitman, London Faber and Faber 1959, pp. 35-51/

"Sacrifice," Translated by Hannah Goldstein, *Harper's* 228 (February 1964) pp. 61-64.

"Converts," Translated by Joseph Singer, *Commentary*, 38 (December 1964), 46-48.

"One Day of Happiness," *Cavalier*, September 1965, pp. 19,78-84.

"The Strong," *American Judaism*, Winter, 1965-66.

"The Prodigal Fool, Translated by the author and Elizabeth Shub, *The Saturday Evening Post*, 26 February 1966, pp. 64-66, 68-69.

"The Boudoir," Translated by the author and Elizabeth Shub *Vogue* April 1966, pp. 148-49, 124.

"My Adventures as an Ideal list," Translated by Aliza Shevrin and Elizabeth Shub, *The Saturday Evening Post*, 18 November 1967, pp. 68-73.

"Peephole in the Gate," Translated by the author and R.S. Finkel, *Esquire*, 25 (April 1971), 124-27.

"Escape from Civilization." Translated by the author and R.S. Finkel. *The*

New Yorker r, 16 May 1972, pp. 43-36.

"Tanhum." *The New Yorker*, 17 November 1975, pp. 41-45.

"The Power of Darkness." Translated by Joseph Singer, *The New Yorker*, 2 February 1976, pp. 31-35.

"Dalfunk's Where the Rich Live Forever," *The New York Times Magazine*, 28 March 1976, pp. 111.

"A Cage for Sutan." Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 24 May 1976, pp. 38,4.

"The Psychic Journey." Translated by Joseph Singer, *The New Yorker*, 18 October 1976, pp. 38-44.

"Two" Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 20 December 1976, pp. 37-42.

"Yochna and Shmelke." Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 14 February 1977, pp. 39-42.

"Elka and Meir," Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 23 May 1977, pp. 36-42.

"Two Weddings and One Divorce." Translated by the author and Alma Singer. *The New Yorker*, 29 August 1977, pp. 28-33.

"The Boy Knows the Truth," Translated by the author, *The New Yorker*, 17 October 1977, pp. 48-53.

"One Night in Brazil." Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 3 April 1978, pp. 34-40.

"The Bus." Translated by Joseph Singer. *The New Yorker*, 28 August 1978, pp. 30-51.

Books About Singer

Allentuck, Marcia, ed. *The Achievement of Isaac Bashevis Singer*. Canbondale: Southern Illinois University Press, 1970.

Buchen Irving H. *Isaac Bashevis Singer and the Eternal Past*. New York University Press, 1968.

Malin, Irving, ed. *Critical Views of Isaac Bashevis Singer*. New York: New York University Press, 1969.

Malin, Irving. *Isaac Bashevis Singer*. New York: Federick Urgar, 1972.

Rosenblatt, Paul, and Koppel, Gene. *A Certain Bridge: Isaac Bashevis Singer*. Tucson University of Arizona, 1971.

Siegel, Ben. *Isaac Bashevis Singer*. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1969.

Critical and Biographical Articles

*Alter, Robert. "Shosha." *The New Republic*, 16 September 1978, pp. 20-22

Blocker, Joel, and Elman Richard. "Interview with I.B. Singer." *Commentary*, 36 (November 1963): 36-72.

Burgin, Richard. "Isaac Bashevis Singer Talks About Evening," *New York Times Magazine*, 26 November 1978, pp. 24-26, 32-38, 42-48.

"Isaac Bashevis Singer's Universe," *The New York Times Magazine*, 3 December 1978, pp. 38-40, 44-46, 50-52.

Chametzky, Jules. "The Old New in New Times," *The Nation*, 30 October 1967, pp. 436-38.

Colwin. Laurie. I B. Singer. Storyteller. *The New York Time Book Review*, 23 July 1978, p.1.

Elman, Richard. "Singer of Warsaw," *The New York Times Book Review*, 8 May 1966, pp. 1, 34-36.

"The Spinoza of Canal Street," Holiday, 38 (August 1965), pp. 83-87.

"Feldman., Irving. Fool's Paradise," *Book Week*, 30 October, 1966, p.4.

"The Shettl World." *The Kenyon Review*, 2 (Winter 1962): 173-77.

Fenyvesi, Charles. "A Dybbuk in DC." *The New Republic*, 21 October 1978, pp. 17-18.

Fiedler, Leslie. "The Circumcized Philistine and the Usynagored Jew,", *American Judaism*, 16 (Fall 1966). 30,33-36.

Fixler, Michael. "The Redeemers, Themes in the Fiction of Isaac Bashevis Singer." *The Kenyon Review*, 26 (Spring 1964): 371-86.

Flender, Harold: "Isaac Beshevis Singer," *The Paris Review*, 11 (Fall 1968): 53-73.

Frank, M.Z. "The Demon and the Earlock," *Conservative Judaism*, 20 (Fall 1965): 1-9.

Goodheart, Eugene "Singer's Moral Novel." *Midstream*, 8 (September 1962): 99-102.

Vemley, Cecil, Isaac Bishevis Singer *In Dimensions of Midnight Poetry and Prose*, edited by Elaine Gottlich, Atheos Ohio University Press, 1966, pp. 217-33.

Hindus, Million. "The False Messiah," *New Leader*, 28 November 1955, pp. 24-26.

"The Family Moskat," *The New York Times Book Review*, 14 March 1965,

pp. 4, 44-45.
"Isaaac Bashevis Singer," *Jewish Heritage Reader*, edited by Morris Adler, New York: Taplinger Publishing Company, 1965.
Howard, Maureen. "Isaac the Fool." *The New Republic*, 21 October 1978, pp. 15-17.
Howe, Irving. "Demonic Fiction of a Yiddish Modernist," *Commentary*, 30 (October 1960): 350-53.
"I.B. Singer, Storyteller," *Encounter*, 26 (March 1966): 60-70.
"In the Day of a False Messiah," *The New Republic*, 31 October 1955, pp. 20-22.
"The Other Singer," *Commentary*, 41 (March 1966): 78-82.
"Stories: New, Old and Sometimes Good," *The New Republic*, 13 November 1961, pp. 18-19.

Hughes, Catharine R. "The two worlds of Isaac Singer," America, 18 November 1967 pp. 611-13.
Hughes, Ted. "the Genius of Isaac Bashevis Singer," *The New York Review of Books*, 22 April 1965, pp. 8-10.
Hyman, Stanley Edgar. "Isaac. Marvels," *New Leader*, 21 December 1961, pp. 17-18.
"The Yiddish Hawthorne," *New Leader*, 23 July 1962, pp. 20-21.
Jacobson, Dan. "The Problem of Isaac Bashevis Singeeeeer," *Commentary*, 39 (February 1965): 48-52.
Jonas, Gerald. "*People with a Choice*," *The New York Times Book Review*, 5 November 1967, pp. 1, 52.
Kahn, Lothar, *Jewish Horizon*, 30 (November-December 1966): 16,18.
Kazin, Alfred, "His Son, the Storyteller," *Book Week*, 24 April 1966, pp. 1,10.
"*Passions and Other Stories* by Isaac Bashevis Singer." *The New Republic*, 25 October 1975, pp. 24-25.
"The Saint as Schlemie," *New Leader*, 4 August 1958, pp. 21-23.
Kibel, Alvin Charles. "The Political Novel," *The Reconstructionist*, 31 October 1957, pp. 27-32.
Kolatch, Mollie. "With Singer in the Shtetl." *Jewish Life*, 33 (November-December 1965): 51-54.
Kresh, Paul. "An Early Masterpiece by I.B. Singer." *Hadassah Magazine*, 49 (December 1967): 18-19.
"A Master Storyteller," *Haddash Magazine*, 50 (October 1968): 24.

"Singer's Demons Move to New York Streets," *Hadassah Magazine*, 52 (January 1971): 15.
"A Jewish Pixie," *Hadassah Magazine*, 60 (February 1979): 10-12, 25-26, 28.
Ludwig, Jack. "The Two-Fold Nature of Truth." *Midstream*, 4 (Spring 1958): 90-93.
Madison, Charles. "I. Bashevis Singer: Novelist of Hasidic Gothicism." *Yiddish Literature: Its Scaope and Major Writers*. New York: Frederick
Ungar, 1968, pp. 479-99.
Miller, Henry. "Magic World of Imps and Villagers," *Life*, 11 December 1964, pp. 14-20.
Pinsker, Sanford. "The Isolated Schlemiels of Isaac Bashevis Singer." In *The Schiemel as Metaphor*. Carbondale: Southern Illinois University Press, 1971, pp. 55-58.
Pondrom, Cyrena N. "Isaac Beshevis Singer: An Interview and a Biographical Sketch." *Contemporary Literature*, 10 (Winter, Summer 1969): 1-38, 332-51.
Prescott, Peter. "Singer the Magician," *Newsweek*, 16 October 1978, pp. 97-98.
Riechek, M.A. "Storyteller." *The New York Times Magazine*, 23 March 1975, pp. 16-18.
Rosenthal, Raymond. "The Darkness of the Glass." *New Leader*,9 May 1966, pp. 13-14.
Schulz, Max F. "Isaac Bashevis Singer. Radical Sophistication and the Jewish-American Novel." Paper read at the MLA Convention, Decmber 1967.
Sneaker, Israel. "Isaac Bashevis Singer Scotic," *Atlanff, Monthly*, 226 (July 1970): 86-100.
Siegel, Ben, Sacred and Profane: "Isaac Bashevis Singer's Embattled Spirits," 6 (Spring 1963): 24-47.
Soutag, Susan. "Demons and Dreams," *Partisan Review*, 29 (Summer 1962): 460-63.
Straus, Dorotheal. "The Courtyard and the Waiting Room," *Palaces and Prisons*. Boston: Houghton Mifflin, 1976, pp. 130-43.
Sundel, Alfred. "The Last of the Yiddish Mohicans," *New Leader*, 11 December 1961, pp. 20-22.
Telker, Judde. "Unhistorical Novels," *Commentary*, 21 (April 1956): 393-96.

Turan, Kenneth. "Isaac Bashevis Singer: I walk on Mysteries," *The New York Times*, 28 December 1976, pp. C1, C3.

Wachtel, Nili. " A Portrait ofIsaac Bashevis Singer: Freedom Through Slauery. *Midstream*, 23 (May 1977): 75-80.

Wincelberg, Shimon. Proving a Varnished as *New Leader*, 26 February 1968, pp. 26-29.

انہدامِ ذات سے تعمیرِ کائنات تک

وِلیم فاکنر

مسی سپی یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں پروفیسر ڈاکٹر بشپ شیکسپیئر کے ڈرامے اوتھیلو پر لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے اختتام پر انہوں نے سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر نے ایک کمزور، میانے قد مگر کم آمیز نوجوان کو کھڑا کیا اور پوچھا:

"شیکسپیئر اوتھیلو کے منہ سے جب بات کہلا رہا تھا تو اس کے ذہن میں کیا تھا۔؟"

"جناب میں کیسے جان سکتا ہوں؟" لڑکے نے جواب دیا۔ "یہ تقریباً چار صدیاں پہلے کا ذکر ہے اور میں وہاں موجود نہ تھا۔" (۱)

کلاس روم میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ پروفیسر نے گھبرا کر لڑکوں کی طرف دیکھا اور پھر حیرت سے نوجوان لڑکے کی طرف جیسے اسے اس جواب کی اس سے توقع نہ ہو۔ پروفیسر بشپ کے چہرے پر پہلے خفت اور پھر غصے کے آثار ابھرے اور وہ تیزی سے کلاس روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے جواب پر سب لڑکے ہنس رہے تھے، مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی بدستور حاوی تھی۔ یہ لڑکا سب سے الگ تھلگ، کم گو اور اپنے اندر کے آفاق میں گم رہنے والا، آزردہ روح، مگر امریکی ناول

کے نفلک الافلاک کا سب سے درخشاں تخلیق کار ولیم فاکنر تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ولیم فاکنر اپنے استاد کا مذاق اڑانا چاہتا تھا؟ یا وہ لاشعوری طور پر استاد کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ جو سبق وہ پڑھا رہا تھا وقت اس سے چار صدیاں آگے نکل آیا ہے؟ اور ولیم فاکنر ماضی میں زندہ رہنے کی بجائے حال کے لمحۂ موجود میں اپنے وجود کا ادراک چاہتا ہے؟

ولیم فاکنر کی نظریں حال کی تنگنائے سے آگے دور بہت دور مستقبل کے منہاج رفعت پر مرکوز تھیں۔ وہ اپنے موجود کے انہدام پر مستقبل کی تعمیر کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ دور اس کی خوابیدگی سے جاگنے کے اس مرحلے تخلیق و تعمیر کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے، جس سے نئے شعوری ادراک کی نیا بت نے اس کا خیر مقدم کرنے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ دور اس کی روح کے ٹریجیڈی یا سیت اور اضطراب کی زنجیریں توڑنے کے آغاز کا دور تھا۔ جس سے آگے بدل اور احساس کے علاقے میں مبتلا ایک نیا جہاں سانس لیتے محسوس ہوتا ہے۔

ولیم کتھبرٹ فاکنر WILLIAM CUTHBERT FAULKNER ۲۵ ستمبر ۱۸۹۷ء میں البانیے ALBANY میں پیدا ہوا۔[۵۵] اس کے والد کا نام مرے کلارک فاکنر MURRAY CLARK FAULKANER اور والدہ MAND FANDKNER تھیں۔

ولیم فاکنر کا خاندان اپنے علاقے کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر امریکی خانہ جنگی کے دور میں اس کے پردادا کرنل ولیم فاکنر کو اس علاقے میں غیر معمولی حیثیت حاصل تھی، مگر وہ ۶۴ سال کی عمر میں اپنے کاروباری شریک تھرمنڈ کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اس کے دادا جے ڈبلیو ٹی فاکنر اپنے علاقے کے قابل ذکر لوگوں میں شامل ہوتے تھے اور ولیم فاکنر کے والد مرے فاکنر پر ان کی شخصیت کا دبدبہ اس حد تک تھا کہ وہ ساری زندگی ان کے اثرات سے باہر نہیں آسکا۔ جس کے سبب اس کی اپنی شخصیت کبھی ابھر کر سامنے نہ آسکی اور جس کے مضر اثرات ولیم فاکنر کی

شخصیت پر بھی مرقسم نظر آتے ہیں۔ مرسے فاکنر کالج نہیں جانا چاہتا تھا۔ اپنے باپ کے حکم پر اس نے تعلیم مکمل کی، مگر اپنی زندگی میں انتخاب کی صلاحیت کبھی حاصل نہ کر سکا اور ساری زندگی باپ کے ریلوے روڈ، گھوڑوں اور دیگر کاموں میں گزار دی۔

اس کی والدہ ماڈ CALAYETH COUNTY کے چارلس بٹلر اور لیلیا بٹلر کی بیٹی تھی۔ ماڈ کا والد نرم زو تھا، جبکہ علاقے میں امن و امان رکھنے اور ڈسپلن میں اس کی بڑی شہرت تھی، مگر گھر میں بیوی کے تند مزاج کے سامنے اس کا دبدبہ اور ڈسپلن بے بس تھا۔ ماڈ کی والدہ نہایت اعلیٰ پائے کی آرٹسٹ، سخت گیر اور طباع BUPTEST مذہب پرست ہونے پر سختی سے عمل پیرا تھی۔ جس کے سبب میاں بیوی میں کبھی ایک دوسرے کے لئے گنجائش پیدا نہ ہو سکی۔ ابھی ماڈ سترہ برس کی تھی کہ اس کا باپ چارلس بٹلر انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا۔ چنانچہ ماں نے اپنی بیٹی کی تربیت پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ وہ ایک اچھی آرٹسٹ تھی اور ایک بار اسے روم جانے کے لئے فن کار کی حیثیت سے سکالرشپ بھی ملا، مگر اس نے اپنی بیٹی کو تنہا چھوڑ کر جانا پسند نہ کیا اور سکالرشپ قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اس حوالے سے ماڈ کی شخصیت پر ماں کے گہرے اثرات تھے اور آرٹس میں اس کی دلچسپی ماں سے ورثے میں ملی تھی وہ ماں کی طرح مصوری اور سنگ تراشی میں اچھی شہرت رکھتی تھی مگر مالی اعتبار سے برے حالات کے سبب انہیں کئی سال تک کبھی ایک اور کبھی دوسرے رشتہ دار کے گھر جا کر رہنا پڑا۔ اس مہاجرت نے اس کی شخصیت میں فروتنی پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس نے ایک ادارے میں سیکرٹری کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تو ان کے مالی حالات قدرے بہتر ہوئے۔

ان دنوں مرے فاکنر اپنے باپ کے کاروبار ریل روڈ میں ٹریول ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات ہوئی، جس کے نتیجے میں ۷ نومبر ۱۸۹۶ء میں مرے فاکنر اور

ماڈ چارلس نے آپس میں شادی کر لی اور شادی کے دس ماہ بعد ولیم فاکنر ان کے ہاں پیدا ہوا۔

۱۸۹۸ء میں اس کا خاندان البا نے سے رپلے آگیا، جہاں ۱۹۰۱ء میں اس کا بھائی جان پیدا ہوا، جب کہ ۱۸۹۹ء میں اس کی بہن پیدا ہوئی تھی۔ بھائی کا نام مرے جیک فاکنر تھا۔ ۱۹۰۲ء میں مرے فاکنر آکسفورڈ میں باپ کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ جہاں اس کا استقبال زیادہ گرم جوشی سے نہیں ہوا۔ مرے فاکنر یہاں آنے کے بعد اپنی ماں کی طرف زیادہ راغب ہوا اور بیوی نظرانداز ہونے لگی جس کے سبب ماڈ کی نفسیات میں مفارقت کا لاشعوری جذبہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ ان دنوں ماڈ کی والدہ لیلیا ان کے ہاں آئی اور فطری انداز میں ماڈ کا جھکاؤ اس کی طرف ہوا، ولیم فاکنر ماں کی طرف زیادہ مائل تھا، جس کی وجہ سے باپ سے دوری کا ایک نامعلوم احساس اس میں پیدا ہونے لگا۔ نانی کا رویہ زیادہ تر اس کے بھائی کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا، اس طرح اس چھوٹے سے جزیرے میں نفرت اور محبت کی مختلف لہروں کی صورت نظر آتی ہے۔ یہیں مذہب کے حوالے سے اس میں شک سر ابھارتا ہے وہ اپنی پیدائش سے ہی پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھا۔ جس کے سبب وہ زیادہ کشش سے محروم تھا جبکہ اس کا چھوٹا بھائی زیادہ صحت مند اور جاذب نظر تھا۔ نانی کا التفات دیکھ کر اس میں یہ جذبہ پیدا ہونے لگا کہ ایک مذہبی خاتون جسے اس کے مذہبی اصولوں پر بڑا ناز ہے، پیار کی تقسیم میں اس قدر اخلاقی ناانصافی کیسے کر سکتی ہے۔ اس کے نہایت بچپن کے یہ تاثرات بعد ازاں اس کے ادب پر گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان ہی دنوں ان کے گھر میں چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے رہنے والی نرس کورلن بار CORLIN BAR آگئی اور جلد ہی اس نے گھر میں دوسری ماں کی حیثیت حاصل کر لی۔ کورلن ولیم کو کہانیاں سناتی، خاص طور پر امریکی خانہ جنگی کے عہد میں فاکنر خاندان کی شرکت اور تباہی کے قصے زیادہ ہوتے۔ بچپن کی یہ داستان گوئی اور لاشعوری طور پر امریکی تاریخ کا تسلسل اس کے ذہن میں اس طرح جاگزیں ہو گیا، جسے اس کے فن میں نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۰۷ء میں فاکنر کی زندگی میں محبت سے محرومی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں بہن کی موت اور موت سے پہلے کی اذیت اس کے ذہنی پردوں پر کچھ اس طرح مرتسم ہوئی کہ جب اس کے گھر میں کھچاؤ بڑھ کر پورے ماحول کو آلودہ کرنے لگتا ہے تو ایک نامعلوم سا احساس اس کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے، جس کی آوازیں بعد ازاں اس کے معرکتہ آرا ناول THE SOUND AND FURRY میں بھرپور سنائی دیتی ہیں۔ جہاں یہ تصور کہ "موت ہماری ایک مسلسل آشنا ہے" غایت الامر اس کے نظریہ فن کی تعمیر کرتا نظر آتا ہے۔ ماں بچی کے صدمے میں مبتلا ہو کر مزید داخلیت پسند، ملول اور تنہائی پسند ہو گئی تا آنکہ اس کے چوتھے بچے کی پیدائش نے اس کے زخموں کو ماند کرنے میں مدد دی۔

۱۹۰۹ء میں اس کے اور باپ کے درمیان نامحسوس کھچاؤ پیدا ہونے لگا۔ اس میں باغیانہ عنصر غالب الجا۔ چوتھے بچے کے بعد ماں کی نظر التفات کی محرومی نے اس میں دردون ذات زندگی اور انہدام کے رویے نے ایک ساتھ اس کے اندر سے جنم لینا شروع کیا۔ ان ہی دنوں میں دو بہنیں اسٹیل ESTELLE اور SALLIE سے ملاقات ہوئی۔ اس کی آپ بیتی ELMER میں اس دور کی یادیں تازہ ہوتی نظر آتی ہیں۔ اسی دوران وہ سکول میں داخل ہو چکا تھا ماں شام کو بچوں کو پڑھاتی تھی، مگر اس میں باغیانہ رویہ اب واضح شکل اختیار کر رہا تھا۔ وہ باپ اور اس کی گھریلو اقدار کو توڑنے لگا اور گھر کے فرسودہ اصولوں سے انحراف کے راستے پر چل نکلا۔ وہ ہر اس کام کو کرنے سے انکار کر دیتا، جو اس کا باپ جبراً یا اس کی مرضی کے خلاف کرانا چاہتا، وہ گھنٹوں کرسی پر بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر کے منظر کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتیں۔ باپ کی آوازیں اس کے کانوں کے پردے سے ٹکرا کر بے اثر لوٹ جاتیں، اس کا باپ تھک جاتا اور کہتا کہ اس نے آج تک اس قدر کاہل لڑکا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ ولیم فاکنر ان دنوں اپنی کاپی پر مختلف تصویریں بناتا، منظر کشی

کرتا اور ڈرائنگ کی کاپی ایسے پکچروں سے بھری ہوتی جس میں اس کے اندر جاگتے ہوئے فن کی نوید تھی، مگر مرے فاکنر اسے رد کر دیتا اور اسے "ڈھیٹ" کے نام سے پکارتا۔ ۱۹۰۹ء میں اس کا دادا ایک کار خرید کر لایا، جو اس علاقے میں پہلی کار تھی۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے YALE سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کا باپ خواہشمند تھا کہ وہ قانون کی ڈگری حاصل کرے، مگر اس کے اندر زندگی کے بارے میں کوئی ایسا تصور موجود نہیں تھا، جہاں وہ باپ کی خواہش کو جگہ دے سکتا۔ ان ہی دنوں اس کی ملاقات فل سٹون PHIL STONE سے ہوئی۔ ان دنوں ولیم فاکنر نے شاعری شروع کر دی تھی۔ فل سٹون نے اس کی شاعری کو سراہا اور اسے یہ یقین دیا کہ اس میں ایک بڑا شاعر موجود ہے۔ فل سٹون اس کی نظموں کے حوالے سے اسے مشورے بھی دینے لگا اور مختلف کتابیں پڑھنے اور اس پر بحث کے مواقع فراہم کرکے اسے شاعری کے راستے پر پہنچنے میں مدد دینے لگا۔

اب اس نے اپنے دادا کے بنک میں لیجر کیپر کی حیثیت سے ملازمت شروع کر دی۔ اب اس کے پاس اتنے پیسے ہونے لگے کہ وہ اعلیٰ درجے کے لباس اور جوتے خریدتا اور اعلیٰ درجے کے بپ میں شراب نوشی اور سگریٹ سے اپنی فرسٹریشن کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے لباس اور شراب نوشی میں مترتب انداز کے سبب آکسفورڈ کے انواع میں اسے "نواب" کے نام سے پکارا جاتا۔ لیکن ۲۰ سال کی عمر تک جس طرح وہ اپنے گھر میں اجنبی تھا، اسی طرح اپنے علاقے میں بھی اجنبی رہا۔

۱۹۱۸ء تک پہنچتے پہنچتے فل سٹون کے بعد جس شخصیت نے اس کی روح کو چھیڑنے کی کامیاب کوشش کی وہ اسٹیل تھی۔ گو اسٹیل اس سے بڑی تھی اور جب وہ درجہ دہم میں تھا اسٹیل کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ اسٹیل کے برابر نظر نہ آتا تھا، وہ ایک بھرپور خوبصورت اور بھرے جسم کی لڑکی تھی، جبکہ بچپن میں بیماری کے سبب فاکنر کی جسمانی

نشوونما بھرپور نہ تھی، اس کا قد ۵ فٹ ۵ انچ تھا جبکہ وہ اس سے لمبی تھی، مگر دونوں کے درمیان پیار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا اور دونوں نے زندگی ایک ساتھ گزارنے کا عہد کیا۔

۱۹۱۸ء کا سال ولیم فاکنر کی زندگی میں ایک بہت بڑے حادثے کی صورت رونما ہو رہا تھا۔ آغاز سال میں ایک دوسرے نوجوان شخص کارنل فرینکلن نے اسٹیل کا رشتہ مانگ لیا، یہ ان دونوں کا امتحان تھا، اسٹیل چاہتی تھی کہ ولیم فاکنر پہل کرے اور اگر کوئی صورت نہ بن سکے تو وہ دونوں کسی اور شہر میں جا کر شادی کرلیں، مگر ولیم باغیانہ خیالات کے باوجود شادی میں ماں باپ کو شریک کرنا چاہتا تھا، جب اس نے اس بات کا اظہار اپنے ماں باپ سے کیا، تو نہ صرف وہ بلکہ لڑکی کے ماں باپ نے بھی اسے ناممکن قرار دیا۔ وقت آگے بڑھتا رہا، اسٹیل اسے کسی دوسرے شہر میں جا کر شادی پر اُکساتی رہی، وہ ایسے کرنے سے گریز کرتا رہا، گھر میں مخالفت شدید تھی اور آخر اپریل ۱۹۱۸ء اسٹیل کی شادی کے لئے مقرر ہوا، اب وہ زندگی کے بدترین اضطراب کا شکار ہو چکا تھا، اس کی اس دور کی شاعری میں اس کے اندر کا اضطراب بڑا بھرپور نظر آتا ہے۔ اس کی پریشانی اور بے چینی نے اس کی ماں کو زیادہ مضطرب اور پریشان کر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ اس کے گھر والے اس خیال کے خلاف تھے اور اسے ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتے۔ بے چینی، دُکھ اور کرب نے آخر اسے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ مارچ ۱۹۱۸ء میں فل سٹون کے پاس نیوہیون NEW HEAVEN چلا گیا، جو ان دنوں نیوہیون میں ایک فرم میں ملازم تھا۔ فل سٹون کے پاس آنے سے اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا، اور اس نے زیادہ تر توجہ شاعری کی طرف مبذول کر دی۔ فل سٹون نے کوشش کرکے اسے ملٹری کے ایک یونٹ میں کلرک بھرتی کرا دیا۔ مگر اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایئرفورس میں بھرتی ہو کر پائلٹ کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہوگا، ان ہی دنوں برطانوی شاہی فضائیہ میں پائلٹوں کی بھرتی ہو رہی تھی، مگر

صرف برطانوی نژاد لوگ ہی اس میں رکھے جارہے تھے۔ فاکنر نے فل سٹون کے ساتھ مل کر خود کو انگریز ثابت کرنے کے لئے جعلی کاغذات تیار کئے۔ اپنے نام کے ہجے انگریزوں کے مطابق ترتیب دیئے اور ایک برطانوی نژاد شخص کی وساطت سے اس کی بہن جو آکسفورڈ میں پڑھاتی تھی، تصدیق نامہ منگوایا اور برطانوی فضائیہ میں درخواست بھیج دی جس کے نتیجے میں پائلٹ کی حیثیت سے اسے منتخب کر لیا گیا۔

جون ۱۹۱۸ء میں نیو یارک میں انتخاب کے بعد وہ واپس نیو ہیون پہنچا، اور ملٹری کلرک کی حیثیت سے استعفیٰ دینے کے بعد واپس مسی سپی آگیا۔ جہاں سے ۸ر جولائی کو وہ براستہ نیویارک ٹورانٹو (کینیڈا) اپنی کمپنی میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہوگیا۔ ٹورانٹو پہنچ کر اس نے اپنی جائے پیدائش مڈل سکس انگلینڈ اور تاریخ ۲۵ مئی ۱۸۹۸ء لکھوائی اور زیر تربیت پائلٹ کی حیثیت سے ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء کو شامل کر لیا گیا۔ فضائیہ کی طرف سے اسے کیڈٹ پائلٹ کا نمبر ۱۷۳۷۹۹ ملا۔

اول اول اڑھائی ہفتے اس نے درس و تدریس میں گزارے اور اس کے بعد ایئر بیس AIR BASE میں بھیج دیا گیا اور پرواز سیکھنے لگا۔ ۲۲ نومبر کو اس نے اپنی پہلی تنہا فلائٹ SOLO FLIGHT کی مگر اس سے قبل کہ وہ پائلٹ بنا کر فرانس بھیج دیا جاتا، جنگ کا زور ٹوٹ گیا اور اسے جنوری ۱۹۱۹ء میں فضائیہ سے فارغ کر دیا گیا، جہاں سے وہ واپس گھر آگیا، چند ہی ماہ کے بعد اس کا بھائی جیک جس نے فوج میں بھرتی حاصل کر لی تھی گھر آگیا۔

اسی دوران مشہور جریدے دی نیو ریپبلک NEW REPUBLIC میں اس کی پہلی نظم ۶ر اگست ۱۹۱۹ء کو شائع ہوئی، اور اگلے ہی ماہ اس نے مسی سپی یونیورسٹی میں خصوصی طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لے لیا۔ اس نے انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبان و ادب کا

انتخاب کیا۔ اب اس کی ماں کا خیال تھا کہ فاکنر سے زیادہ توجہ اور استغراق سے پڑھنے والا شاید ہی کوئی دوسرا لڑکا موجود ہو۔ وہ اپنے کمرے میں بچوں کے شور کے باوجود پڑھتا اور شور شرابا قطعی طور پر اس کے کام میں مخل نہیں ہوتا تھا۔

سب اس پر حیران تھے کہ وہ اتنا ذہین طالب علم ہونے کے باوجود کسی ڈگری کے لئے داخلہ کیوں نہیں لیتا، مگر اس کا جواب ہوتا کہ وہ تو صرف زبان وادب سیکھنا چاہتا ہے۔ ایک بار اس نے امتحان میں ۱۰۰ میں سے ۹۹ نمبر حاصل کئے۔ اس دوران شاعری اور سکیچوں کے حوالے سے اس کی پہچان ہونے لگی تھی۔ اس کی نظمیں "دی یونیورسٹی پبلک" میں دوبارہ شائع نہ ہو سکی، تو اس نے یونیورسٹی کے جریدے "دی مسی سپی" میں لکھنا شروع کر دیا اور یہی لکھنے کا جنون بالآخر اسے افسانے کی دنیا میں لے آیا۔ ۶ نومبر ۱۹۱۹ء کے "دی مسی سپی" کے شمارے میں اس کا پہلا افسانہ لینڈنگ ان لک LANDING IN LUCK شائع ہوا، جس نے اسے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی متعارف کرانا شروع کیا۔ یہ افسانہ ایک ایسے کیڈٹ پائلٹ کی کہانی تھی، جو تربیت کے دوران پہلی بار تنہا SOLO FLIGHT جہاز اڑاتا ہے اور جہاز اتارتے وقت زخمی ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ علامتی انداز میں اپنی اس کامیاب سولو فلائٹ کی کہانی بیان کرتا نظر آتا ہے جس کا انجام جنگ بندی کی صورت میں ظاہر ہو کر اسے پائلٹ بننے میں مانع رہا تھا۔ جس طرح کیڈٹ پائلٹ زخمی ہو کر ناکام رہا۔

۲۰ء اور ۲۱ء میں یونیورسٹی میں قیام کے دوران اس کی نظمیں اور سکیچ جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ ۲۱ء کے اواخر میں وہ نیویارک آ کر ایک کتابوں کی کمپنی میں ملازم ہوا جہاں اس کی ملاقات الزبتھ سے ہوئی جس کی شادی بعد ازاں شیروڈ انڈرسن SHIRWOOD ANDERSON سے ہوگئی تھی۔ فاکنر زیادہ دیر یہاں نہ ٹھہرا اور دسمبر ۲۱ء میں واپس آ کر یونیورسٹی میں پوسٹ ماسٹر بھرتی ہو گیا جہاں وہ ۲۴ء تک کام کرتا رہا چونکہ اب

وہ اپنی زیادہ توجہ شاعری اور ادب کی طرف دیتا تھا، جس کے سبب اسے آخر ملازمت سے استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی دوران اس نے پہلا سنجیدہ اور تنقیدی مضمون یوجین اونیل کے ڈرامے پر لکھا۔ جس کو دیکھنے کے بعد اس کے تنقیدی شعور کی داد ملنے لگی۔

ان سالوں میں زندگی میں تحرک کے موضوع پر اس کے کئی سکیچ بھی شائع ہوئے، جنہیں بڑی داد ملی۔ اس دوران جیک نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف سیسل نامی لڑکی سے شادی کر لی، وہ اب قانون کی ڈگری حاصل کر چکا تھا جبکہ اس کا دوسرا بھائی جان اور اس کی بیوی ڈولی آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔

۱۹۲۳ء میں اپنی کتاب کی اشاعت کا مسئلہ فاکنر کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس نے کئی ناشرین کو لکھا، مگر پُرامید جواب کہیں سے نہ ملا۔ نومبر ۲۳ء میں اس نے اشاعتی ادارے فور سیز کمپنی THE FOUR SEAS COMPANY کو مسودہ ارسال کیا، انہوں نے مسودے کو پڑھنے کے بعد لکھا، کہ وہ سالِ رواں کے لئے جس قدر سرمایہ کاری کر سکتے تھے، کر چکے ہیں۔ البتہ اگر وہ اپنی کتاب کی اشاعت کے اخراجات برداشت کرے، تو ادارہ کتاب شائع کر سکتا ہے، کتاب کی فروخت پر اس کی اصل رقم اور رائلٹی دینے کی ضمانت دی جا سکتی ہے، چونکہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے، اس لئے کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔ مسودے کی واپسی کے ساتھ ناشر نے خط لکھا تھا۔ "یہ خوبصورت شاعری ہے مگر وہ نہیں جو لوگ پڑھنا چاہتے ہیں۔"[۴] فاکنر قدرے پریشان ہوا۔ "خدا کی قسم میں اب وہ شاعری کروں گا جو ہمیشہ یاد رہے گی، وہ شاعری جو وہ پڑھنا چاہتے ہیں۔"[۵]

جولائی کے وسط میں اس کے بھائی جان کے ہاں بیٹا جیمس مرے فاکنر پیدا ہوا جبکہ ۳ دسمبر کو شنگھائی سے خبر ملی کہ اسٹیل کے ہاں بیٹا ہوا۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ دراز نہ ہو سکا تھا۔ وہ اب بھی ان ہی جریدوں میں چھپ رہا تھا، جہاں سے آغاز ہوا تھا، البتہ

دی پبلک کے بعد ایک نظم دی ڈبل ڈیکر DOUBLE DECKER میں چھپ سکی تھی۔

فاکنر کے لیئے کتاب کی اشاعت پریشان کن مسئلہ بن گئی تھی۔ آخر فل سٹون نے فور سیزنز کمپنی کو ایک طویل خط لکھا، جس میں اس نے فاکنر کی شاعری کی غیر معمولی تعریف کی اور انہیں کتاب کی اشاعت پر زور دیا۔ آخرکار فور سیزنز والے کتاب کی اشاعت پر راضی ہوگئے اور پہلے ایڈیشن کی اشاعت پر چار سو ڈالر فاکنر کو ادا کرنے کا معاہدہ ہوگیا۔ کتاب کی قیمت ایک ڈالر پچاس سینٹ رکھنے اور تیس سینٹ فی کتاب رائلٹی طے ہوئی جبکہ پہلا ایڈیشن ۱۰۰۰ کی تعداد میں شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ فل سٹون نے فاکنر کی طرف سے ۲۰۰ ڈالر پیشگی ادا کر دیئے اور ۲۰۰ ڈالر آخری پروف کے آنے پر ادا کر دیے گئے۔ کتاب کا انتساب فاکنر نے اپنی ماں کے نام کیا۔ جبکہ فل سٹون نے دیباچے میں فاکنر کی شاعری کو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ کتاب مصنف کے تعارف کے ساتھ پریس میں چلی گئی۔

۱۹۲۴ میں ڈاک خانے والوں نے اس پر نا اہلی سے غفلت اور غیر دلچسپی کے الزامات لگا کر اسے چارج شیٹ کر دیا۔ اس چارج شیٹ میں دیگر الزامات کے علاوہ یہ بھی شامل تھا کہ فاکنر اپنے گاہکوں کے ساتھ بات تک نہیں کرنا پسند کرتا اور زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ الزامات و جوابات کے بعد آخرکار معاملہ اس کے استعفے پر پہنچا اور ۳۱ اکتوبر کو وہ ملازمت سے فارغ ہو گیا۔ اب فاکنر ساری ذمہ داریوں اور پابندیوں سے آزاد تھا اور کتاب کی اشاعت کا انتظار کرنے لگا۔

اس زمانے میں شیرووڈ اینڈرسن امریکہ اور یورپ میں بڑا مقبول لکھاری تھا اور نیو آرلین NEW ORLEANS میں مستقل آباد ہو گیا تھا۔ اس کی دوسری بیوی الزبتھ تھی، جس سے نیویارک کے قیام کے دنوں میں فاکنر کی ملاقات ہو چکی تھی۔ اپنے دوست کے اصرار پر وہ اینڈرسن سے الزبتھ کی معرفت ملا۔ پھر دونوں میں خاصی قربت ہوئی۔ حسن اتفاق دونوں کے درمیان

بہت سے واقعات یکسانیت کے حامل تھے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا، مگر زندگی کے کئی واقعات میں مماثلت تھی جس کے سبب انڈرسن نے اسے بہت پسند کیا۔ ان ہی دنوں اسٹیل بہت دنوں تک شنگھائی میں رہنے کے بعد واپس آگئی تھی، وہ اب تک فاکنر کے ساتھ گزرے لمحوں کو بھول نہیں سکی تھی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کو جب اس کا پہلا شعری مجموعہ دی مار بل فان THE MARBLE FAUN چھپ کر آیا، تو اس کی پہلی کاپی اس نے اسٹیل کو پیش کی اور دوسری اپنی ماں کو۔

فاکنر کا بھائی جیک دیکھ رہا تھا کہ فاکنر جب بھی کسی پرچے کو کوئی چیز بھیجتا ہے، وہ معذرت کے ساتھ واپس آجاتی ہے۔ دسمبر کے آخری دنوں میں جب اس کی ماں نے اسے ایک لفافہ دیا، جس میں سیچرڈے ایوننگ پوسٹ SATURDAY EVENING POST نے اس کا افسانہ واپس بھیجا تھا۔ تو اس نے نہایت جذباتی انداز میں ماں سے کہا "ماں تم دیکھنا ایک روز یہی اخبار میری ہر چیز کو بھاری معاوضے کے ساتھ خریدے گا۔"

کتاب ۱۰۰ صفحات کی تھی، جس میں دو صفحات کا دیباچہ تھا۔ مگر اس دیباچے سے جہاں فاکنر کی تعریف و تحسین کے حوالے سے اس میں خوشی کی لہر پیدا ہو رہی تھی، وہیں فل سٹون کے بعض الفاظ سے اسے سخت مایوسی اور بے چینی بھی ہوئی۔

۱۹۲۵ء کے آغاز میں فاکنر نیو اورلین میں منتقل ہو گیا اور الزبتھ انڈرسن کی دعوت پر ان کے ہاں رہنے لگا۔ اسی دوران اس کے شعری مجموعے پر الزام لگایا گیا کہ ماربل فان کا نام ہاتھوان سے مستعار ہے۔ جس کی فاکنر نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ہاتھوان کو اب تک پڑھا ہی نہیں۔ اس لئے وہاں سے نام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیو اورلین میں اس نے اب اپنے پہلے ناول پر کام شروع کیا جس کا نام اس نے MAY DAY سوچا تھا، مگر جب یہ شائع ہوا تو اس کا نام SOLDIERS PAY رکھا گیا۔

۱۹۲۰ء میں اس کا تنقیدی مضمون، ایک طویل نظم اور کئی سکیچ شائع ہوئے۔ اب انڈرسن کی اعانت سے اس کی تخلیقات دی ڈبل ڈیلر میں شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

جولائی ۱۹۲۶ء میں وہ نیو اورلینز سے واپس آکسفورڈ آ گیا۔ ان دنوں اسٹیل اور اس کے خاوند کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی اور وہ بچوں کے ساتھ آکسفورڈ میں آباد تھی۔ اب وہ ادب کے موضوعات پر بے تکان بات کرتا اور نیو اورلینز کے قیام کے دوران ادبی حلقوں میں سرگرم رہنے کے سبب جو تنقیدی وژن اسے حاصل ہوا تھا، اس نے نہ صرف ادب کو دیکھنے کا شعور دیا بلکہ خود اپنی تخلیقات کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ فل سٹون بدستور ادبی سطح پر اس کی معاونت اور پروموشن میں مصروف تھا۔ اس نے اپنا ناول "سولجرز پے" نیویارک کے اشاعتی ادارے بونی اینڈ لایوَرائٹ BONI AND LIVERIGHT کو بھجوا دیا اور اسی ماہ وہ امریکہ کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس کے پاس صرف پچاس ڈالر جیب میں تھے۔ جہاں گردی کے اس سفر میں اس نے یورپ کے کئی ممالک کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران اس نے اپنے نئے ناول ماسکیٹو MOSQUITO پر کام شروع کر دیا تھا اور فرانس میں قیام کے دوران اس نے کئی نظمیں، افسانے لکھے اور بچوں کے لئے ایک ناول پر کام شروع کیا۔ اس دوران وہ اپنے ناول کے بارے میں ناشر سے خط و کتابت بھی کرتا رہا۔ اس کے سامنے لکھنے کے کئی موضوعات تھے، جن میں سوانحی ناول ELMER بھی تھا۔ اب وہ فرانسیسی میں لکھنے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ پیرس میں کئی ماہ گزارنے کے بعد وہ انگلستان کی سیر پر چل نکلا۔ لیکن لندن میں پہنچنے کے فوراً بعد اسے معلوم ہوا کہ پیرس کے مقابلے میں لندن بہت مہنگا شہر ہے۔ اسے ایک کمرے کے ۵۰ پنس دینے پڑتے تھے جبکہ کھانے پر چار گنا زاید۔ وہ لندن سے کنٹ آیا اور یہاں کے بارے میں اپنی تحریر THESE PEOPLE میں لکھا: " فرانس میں لوگ پیار اور پیسے کے لئے زندہ ہیں مگر انگریز کھانے کے لئے جیتا ہے۔ یہ لوگ پانچ، پانچ وقت

کھاتے ہیں۔"

اس نے جلد ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا، اس کا خیال تھا کہ بونی اینڈ لائیورائٹ والوں کی طرف سے ضرور جواب موصول ہوا ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا، جب وہ پیرس پہنچا، تو اسے نہ صرف لائیورائٹ کا خط ملا۔ بلکہ ناول کی قبولیت کی اطلاع کے ساتھ ۲۰۰ ڈالر پیشگی کا چیک بھی ہمراہ تھا۔ چیک دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ان دنوں وہ مالی بدحالی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ دو صد ڈالر کی آمد اسے امداد غیبی لگی۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوا، کہ اسے کیش کہاں سے کرایا جائے۔ بنک آمادہ نہ ہوتے، وہ امریکی کونسل گیا، انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ چیک واپس بھیج کر ڈرافٹ منگوائے۔ آخر کار وہ برٹش کونسل گیا، جہاں اس نے اپنا وہ ڈرافٹ دکھایا جو اسے کیڈٹ پائلٹ کی تربیت کے اختتام پر ملا۔ فوراً چیک قبول کر لیا گیا اور اسے دو صد ڈالر ادا کر دیئے گئے۔

اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ واپسی کا سفر کر سکتا۔ اس کے پاس اس قدر رقم تھی، کہ وہ تھرڈ کلاس سے پیرس امریکہ اور ریل کے نیو یارک آکسفورڈ کے سفر خرچ کی رقم خرچ کر سکے۔ چنانچہ سال کے اختتام پر وہ امریکہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ آکسفورڈ پہنچنے کے بعد جب ماں نے اسے پیشانی پہ بوسہ دیا، تو اس کی بھوری داڑھی دیکھ کر از راہِ مذاق کہا کہ "شاید تم گزشتہ چھ ماہ سے نہ شیو کر سکے ہو، نہ کپڑے دُھلائے اور نہ ہی غسل کیا" اور ماں کا مذاق اصلاً ایک حقیقت تھی کہ اس کے لباس سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

۲۵ فروری ۱۹۲۶ء کو اس کا پہلا ناول "ری سولجرپے" شائع ہوا جسے خاصا سراہا گیا، اس کے حق میں تبصرے ہوئے مگر بعض تبصرہ نگاروں نے اس کے عریاں مناظر کو ناپسند کیا۔ فاکنر کی ماں اپنے بیٹے کی ناول کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ ماں نے اسے لکھا کہ ماربل فان کی نسبت یہ تخلیق زیادہ جاذب اور جاندار ہے لیکن اس نے بھی جنسی رویوں کو ناپسند کیا۔ اس کے

باپ کا خیال تھا کہ یہ ناول کھول کر دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ مس سپی یونیورسٹی نے ناول اپنی لائبریری میں رکھنے سے انکار کر دیا اور جب انہیں تحفتاً فل سٹون نے بھیجا، تو انہوں نے تحفہ قبول بھی نہ کیا۔ مگر دوسری طرف قارئین کی ایک بڑی تعداد اسے پسند کر رہی تھی۔ پہلی کتاب کی نسبت یہ ۲۵۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ تبصرہ نگاروں کا رویہ مثبت تھا۔

ان دنوں فاکنر نیو اورلین میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ فل سٹون کی سیکرٹری سیلیا سیمپسن بدستور اس کے ایک ایک مسودے کو بار بار اصلاح کے بعد کئی بار ٹائپ کرتی تھی کہ جرائد سے معذرت کے ساتھ واپس آنے کی مسودات کی تعداد میں فرق نہیں پڑا تھا۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ مشہور تھا کہ واپس آنے والے مسودوں سے فل سٹون کے میز کی دراز بھری ہوئی تھی۔

نیو اورلین میں اس نے FATHER NIRAHIM پر کام شروع کر دیا جبکہ اس کا نیا ناول "دی ماسکیٹوز" پریس میں جا چکا تھا، جو بالآخر جون ۲۷ء کے وسط میں طبع ہو کر آ گیا۔ اس ناول کو پہلے ناول کی نسبت زیادہ سراہا گیا، اسے مجموعی طور پر خوبصورت اور وسعت گیر ناول کہا گیا۔

۲۷ء تا ۲۹ء کا عرصہ فاکنر کی معاشی جدوجہد کا عرصہ ہے۔ جہاں اس نے ترکھان، رنگساز، بوتلیں صاف کرنے اور دیگر محنت مزدوری کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ رکھا۔

۵۰ء کے قریب ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تمہیں ایک تسلسل میں پڑھا جائے تو کہاں سے شروع کیا جا سکتا ہے تو اس نے جواب دیا "سارٹوریس SARTORIS سے۔ جہاں میرے وجدانی (الہامی) تخلیقی صلاحیتوں کے آثار ملتے ہیں۔"

سارٹوریس جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس پر پہلا تبصرہ ایک خوشگوار تنقیدی رویے کے ساتھ سامنے آیا، یہ ناول فاکنر کے ابتدائی دور کے خاتمے اور تعمیر کے آغاز کا پتہ دیتا ہے۔ یوکن پٹافا YOKANPATPHA کی صورت میں اس کی اپنی دنیا اس ناول میں آباد ہوتی نظر آتی ہے اور جس کا لینڈ سکیپ اس کی اپنی زمین سے اوپر اٹھ کر اس کے تخلیقی جہاں کا مظہر بنتا

ہے۔ اس پر پہلے تبصرے میں ہی "کرداروں، فضاؤں، اثرات، اسلوب اور موڈ کا ایک وسیع تناظر" کہا گیا۔ اس کتاب کا انتساب اس نے شیروڈ انڈرسن کے نام کرتے ہوئے لکھا " جس کی مدد سے میں پہلی بار شائع ہوا۔"

سارٹوریس کا پس منظر آکسفورڈ کی معاشرت میں ڈوب کر اس طرح مرتب ہوا تھا، کہ اس کا ادراک کئی سطحوں پر ہوتا۔ اس میں ٹھوس واقعات سے علامتی علائق اور پھر نفسیاتی دروبست اپنی پوری تصوریت CONCEPTION میں نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں ماضی اور اس طرح سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں، کہ پڑھنے والا گزرے واقعات کو ابھرتی علامتوں کے ساتھ مس کر کے لمس سے محظوظ ہوتا اور ناول نگار کی ہنر کاری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ گو اس کا بنیادی موضوع جنوبی امریکہ کی معاشرت کا ایک ایسا وظیفہ تھا، جو اکثر جنوبی امریکہ کے لکھاریوں کے ہاں بھی موجود ہے، مگر فاکنر نے پہلی بار نہایت سنجیدگی اور حساسیت کے ساتھ اسے اپنے ناول کے تناظر میں برتا۔ اس میں اس وقت اس کی فنکارانہ صلاحیتیں پوری طرح اجاگر نظر آتی ہیں۔ جب تقابلی اور تضادی رویّے مکمل گرفت کے ساتھ طربیہ اور المیہ میں توازن قائم کرتے ہیں تاکہ مرکزی خیال اور ثانوی جزئیات ناول کی مجموعی ثروت میں اضافہ کر سکیں۔ اس کی خوبی یہی ہے کہ اس میں ایسی تکنیکی اور فنی چابکدستی کے ساتھ کام لیا گیا ہے کہ جزوی یا غیر متعلق واقعات کو کہانی کے بنیادی واقعات کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا کہ ایک دوسرے کو الگ کرنا آسان نہیں رہتا۔ اس ناول کا اسلوب رومانیت اور طنز دونوں شدید منطقوں کو ایک بڑی لہر میں ایک دوسرے کا جزو لاینفک بنا دیا گیا ہے۔

فاکنر نے اس ناول میں بعض ٹھوس اشیا ءکو علامتی بنا کر ماضی کو حال میں پیش کرنے کا ایک تجربہ بھی کیا ہے۔ بوڑھے کرنل کا کردار اس کے پردادا کرنل فاکنر کے کردار سے اُبھرتا ہے اور پرانے برآمدے کے ٹھوس وجود کو علامتی آہنگ میں پیش کر کے ایک المیہ بہتر بنانے

کی فاکنر کی ہنرکاری خوب ہے، بعض تبصروں میں اسے ناکامی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر فاکنر کی فکری روا اپنے اظہار میں کامیاب رہی ہے۔ یہاں اس نے جنوبی امریکہ کی معاشرتی روایات اور دیومالائی عناصر کو ابھارنے کی کوشش کی جسے دیکھتے ہوئے بعض نقادوں نے فاکنر کو "روایتی دیومالائی اور المیہ ادیب" قرار دیا اور یہ کہ فاکنر جنوب کی بہترین رئیسانہ روایتوں کی پیداوار تھا اور اپنے ناولوں میں جنوب کے زوال کا ماتم کرتا اور اس کو تصویر کرتا نظر آتا ہے۔[۳۴]

جون ۱۹۲۹ء فاکنر کی زندگی میں ایک انقلاب لے کر آیا۔ گیارہ سال قبل اس کی زندگی میں اضطراب اور یاس کا جو لامتناہی سلسلہ دراز ہوا تھا، بظاہر اس کے خاتمے کا وقت آیا۔ اسٹیل کی اپنے خاوند سے علیحدگی بالآخر طلاق پر منتج ہوئی تو فاکنر نے اسٹیل سے مل کر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس شادی پر کوئی خوش نہیں تھا۔ اس کا باپ اور ماں دونوں نے اسے ناپسند کیا اور سخت مخالفت کی۔ اس کے بھائی جیک نے اس کی توجہ مالی مشکلات کی طرف مبذول کراتے ہوئے شادی کو مؤخر کرنے کے لئے کہا۔ فل سٹون بھی اس شادی پر خوش نہ تھا۔ اس کے نزدیک یہ شادی فاکنر کے لئے تباہی لا سکتی تھی اور گیارہ سال کی مسلسل محنت جس کے سبب فاکنر ادبی سطح پر شناخت کے قریب تھا، جسے نقصان پہنچ سکتا تھا اور اس کے لئے پہلی سی رفتار کے ساتھ کام کرنا آسان نہ ہوگا۔ مگر اس کے سامنے تمام دلائل و براہین بے سود تھے، وہ ۲۰ جون ۱۹۲۹ء جمعرات کے روز عدالت میں پہنچے، شادی کی اجازت لی اور ماں کی چھوٹی شورلیٹ کار میں اسٹیل کو لے کر گرجے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اپنے ہونے والے سسر میجر لیم اولڈہیم کے پاس رکا اور اسے شادی کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی اس پر آمادہ نہ تھا لیکن اس نے کہا کہ وہ ان کی راستے کی دیوار نہ بنے گا۔ وہاں سے دونوں گرجے پہنچے اور بظاہر فاکنر کا گیارہ سالہ پیار کا بن باس ختم ہو گیا مگر ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔ اسٹیل کے اپنے گرجے کے پادری نے ان کی شادی کی رسومات ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اسٹیل کو طلاق کی ایک سال

کی مدت ختم کئے بغیر شادی کی اجازت دینے سے معذرت کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ قریبی گاؤں کے ایک گرجے میں جاکر شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں سے فاکنر کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔

جون کا مہینہ شادی کے ہنگاموں میں گزرا اور وہ جولائی کے اوائل میں ادبی دنیا میں واپس لوٹ آیا، جہاں اس کا ناول آواز وجلال THE SOUND AND THE FURRY کا پروف اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بعض ترجیحات پر اعتراض تھا۔ خاص طور پر کتاب کے ایڈیٹر والسن نے سکاں زقند کو جملوں کے درمیان فاصلہ دے کر ظاہر کیا تھا جو فاکنر کے لیے اس لیے قابلِ قبول نہ تھیں کہ اس طرح پڑھنے والے کے ذوقِ جمال کو دھچکا لگتا تھا۔ آخر کار پروف پر خاصی بحث وتمحیص کے بعد اسے پریس میں بھجوا دیا گیا اور فاکنر کی زندگی کا ایک شاندار موڑ ساؤنڈ اینڈ فری ، ۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو شائع ہو کر آ گیا۔ امریکہ کے اکثر جریدوں نے اس پر شاندار تبصرے کئے اور اسے کامیاب ناول قرار دیا، سب سے اچھا اور تفصیلی انٹرویو نیو یارک کے جریدے "ہیرالڈ ٹریبون کے ادبی ایڈیشن میں لائل سیکسن نے دی۔ ساؤنڈ اینڈ دی فری کو شاہکار قرار دیتے ہوئے کہا " میں نہایت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ فاکنر کی یہ تصنیف ایک عظیم ناول ہے۔" ۹

ناول کا پہلا ایڈیشن ۱۷۸۹ء کی تعداد میں شائع ہوا۔ اس پر جس قدر تبصرے ہوئے اس کے مقابلے میں فروخت کا گراف بہت نیچے تھا۔ خصوصاً دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں افراطِ زر کے سبب مجموعی طور پر کتب منڈی کا رجحان مندی پر تھا مگر مئی ۱۹۳۰ء میں جب بہت بڑی تعداد میں نقادوں نے اس پر تبصرے کئے تو کتاب کی فروخت میں قدرے تیزی سے پیش رفت ہوئی۔

" دی ساؤنڈ اینڈ دی فری " بنیادی طور پر ایک ایسا المیہ ناول ہے جس کا لینڈ سکیپ ایک مخصوص خطۂ ارض میں گم تہذیب کی بازیافت سے زیادہ اس کے کھو جانے کے ادراک سے ابھرتا

دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں بڑے تناظر کا تقاضا کرتا ہے وہ فاکنر کے اس ناول میں ادراک اور اپنی جڑیں تہذیبی زمین میں دور تک گہری کرتا نظر آتا ہے۔ بقول ہنری جیمیس "فن کا پھولا وہیں کھلتا ہے، جہاں مٹی گہری ہو"[1] اور دی ساونڈ میں آباد موضوعی استغراق گہرے تہذیبی المیے کو پس منظر بنا کر سامنے آتا ہے۔ رچرڈ چیس کا کہنا ہے کہ "یہ ناول عہدِ جدید کا ذہن ہی لکھ سکتا ہے"[2] اس لئے کہ جدید حسیت کے جو در بیسویں صدی میں کھلے اس کا وجود انیسویں صدی میں مفقود تھا۔ پھر تاریخ کا شعور اور طنزیہ ذہن کی تخلیق بیسویں صدی کی عطا ہے۔

کہانی جس فرضی دنیا یوکن پٹ نا YOKANPATPHA میں شروع ہوتی ہے، اس کی ساری فضا مسی سپی کے جغرافیے سے مماثل ہے، جہاں یورپ سے نقل مکانی کرکے کولیس خاندان کے آخری لوگ آکر آباد ہوتے ہیں۔ مسٹر کولیس ایک معمولی وکیل ہیں جس کی زندگی کا عام رویہ ایک شراب نوش کا ہے، جو جوانی میں مرجاتا ہے۔ مسز کولیس سدا بیمار رہتی ہے اور بیماری اس کے مزاج میں تلخی اور سنک پن کو ابھارتی ہے۔ اس کے چار بچے ہیں جو مزاجاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

یہ کہانی قدرے اختلاف کے ساتھ خود فاکنر کے خاندان کی کہانی بھی بن جاتی ہے اور اس تسلسل کا حصہ ہے جس کے ابتدائی نقوش اس کے ناول سارٹوریس میں نظر آتے ہیں اور وانش درکا کے کردار میں خود مصنف بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے، جس طرح فاکنر اپنے لوگوں میں اجنبی اور تنہا تھا، یہ کردار بھی اپنے ماحول میں تنہا اور اجنبی نظر آتا ہے۔ یہ کردار اس کے ابتدائی ناول دی سولجرپے میں بھی ہے، لیکن سارٹوریس میں وہ اس کردار اور اپنے فنی علائق کو پہلی بار امریکی ناول کی موضوعی روایت سے الگ لے جانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ "دی ساونڈ" میں وہ ایک الگ دنیا آباد کرکے جدید عہد کے زندہ ذہن اور باشعور فن کار کی طرح سامنے آتا ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے جنوبی امریکہ کے زوال کی مکمل تاریخ ہے۔ یہ ناول

جو ایک خاندان کے زوال کی کہانی ہے، اصلاً ایک عصر کے زوال کی کہانی ہے جس پر خانہ جنگی کے بعد کے اثرات ایک شدید اور گہرے المیے کو ابھارتے ہیں۔

ناول کا پورا منظر نامہ شعور اور لاشعوریت یا غیر استدلالی رویوں کے درمیان تضاد کی فضا سے رستیخز ہے۔ اس کا موضوع بقول فاکنر مرتب ذہنی دروبست میں مکمل نہیں ہوا بلکہ لکھتے ہوئے کہانی اور کردار جس سمت میں اسے لے کر چلتے رہے، اس کا قلم اُدھر آگے بڑھتا رہا۔ اس طرح شعوری سطح پر لاشعوری تاریخی ادراک اس کے ناول کی ترتیب اور تخلیق کے پیچھے مواد کے طور پر موجود نظر آتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ناول اپنی ترکیب میں دو عناصر کو ساتھ لے کر چلتا ہے جو نہ صرف منظر بہر دو صورتوں میں اپنی اپنی فطرت کے مطابق مراجعت کرتے نظر آتے ہیں۔ فاکنر کا کہنا ہے کہ اس نے اس کہانی کو پانچ مرتبہ لکھنے اور ان خوابوں کو تعبیر کرنے کی کوشش کی جو مسلسل اظہار کے لئے مجھے بے چین کیے رہے تا آنکہ میں انہیں لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ کہانی اظہار چاہتی تھی، جو غایت الامر فاکنر کا اپنا ماضی اور اس کے وہ شدید مسائل ہیں، جو اس کے سامنے تھے۔ فاکنر کا یہ کہنا بھی ہے کہ ہر ادیب اپنے ابتدائی ادوار میں اپنی آپ بیتی ہی بیان کرتا ہے کیونکہ وہ وہی کچھ جانتا ہے جو اس پر گزرتی ہے اور وہ صرف اپنے اندر ہی دیکھ سکتا ہے، اپنے تجربوں کو ہی محسوس کر سکتا ہے اور اس حوالے سے فاکنر کی تمام تخلیقات اس کی اپنی زندگی کے تجربات کا اظہار بھی ہے اور اس کی سائیکی کا حصہ بھی، جو قارئین کی نظروں سے اب تک اوجھل تھا، شاید اس کی اپنی نظروں سے بھی۔ اور وہ اس ناول میں اپنی اندرونی پیچیدگیوں کو زیادہ اعتماد کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ فاکنر نے اپنے درونِ ذات اضطراب کو، پس گرفت میں لے کر کہانی کی بنت اور کرداروں کے حوالے سے جس طرح اس ناول کا حصہ بنایا ہے، وہ سارٹورس کے کردار بے یارڈ BAYARD میں غیر مؤثر، دھندلا، تکلیف دہ نظر آتا ہے، یہاں فاکنر اپنی نفسیاتی دشواریوں کا نہ تو ادراک

حاصل کر سکا تھا اور نہ ہی انہیں مؤثر پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔

ناول کے نفسیاتی پس منظر کے ساتھ ساتھ کرداروں کی آپس میں علامتی وابستگی بھی فطری دروں بینی کی نئی رد قائم کرتی دکھائی دیتی ہے جو فاکنر کی کردار سازی اور کرداروں میں ربط باہم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا خوبصورت آغاز ہے۔ اس ڈرامے کا ایک ڈرامائی وصف بھی ہے کہ اس میں جس قدر منظری پورٹریٹ نمایاں ہے، اسی قدر مکالمہ بھی سنائی دیتا ہے۔

اپنے اس ناول کے بعد فاکنر نے کئی تخلیقات پر بیک وقت کام شروع کیا، ان میں ایز آئی لے ڈائنگ (جب میں بستر مرگ پر تھی) AS I LAY DYING بھی شامل تھا۔

اسے ابھی قبولیت کی وہ منزل نہ ملی تھی جہاں ایک فنکار کو کلی اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر فاکنر کا تخلیقی سفر نہ صرف تیزی سے آگے بڑھتا رہا بلکہ ہر ناکامی اسے ایک قدم آگے لے جانے کا سبب بنی۔ ۶ راکتوبر ۱۹۳۰ء کو اس کا نیا ناول شائع ہوا۔ ۲۰ نومبر کے دی نیشن THE NATION میں کلفٹن فیڈی نے اسے "پریشان کر دینے والا متحرک ناول" قرار دیا جس کے پیچھے تخلیق کار کا ذہن اس معاشرتی اتھلے دانشورانہ مزاج کو چھوئے بغیر" اچھوتے انداز میں کام کرتا نظر آتا ہے۔ کلفٹن ناول کی فضا اور آفاق کو خمیدہ مگر اس کا اپنا تخلیق[۱۴]" کہہ کر خراج تحسین اور تحیر کا ایک ساتھ اظہار کرتا ہے۔ ایک بار پھر اس ناول میں فاکنر کے لئے نئے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ اب اس فن کی توصیف انگلستان کے ادبی فلک پر بھی نمایاں نظر آتی ہے ــــ RICHARD HUGHES اس کے فن کے پہلے قدر دانوں میں شمار ہوتا ہے، جس نے انگلستان میں اس کے فن کو سراہا اور یورپ میں اسے متعارف کرانے میں اولین کام کیا۔

اسی دوران فاکنر نے افسانے پر کام شروع کیا اور باقاعدہ رجسٹر بنا کر اس میں افسانوں اور ان جریدوں کے نام درج کیے جنہیں وہ افسانے بھیجتا رہا۔ اس رجسٹر کے اندراج کے مطابق وہ اپنے افسانے سب سے پہلے ملک کے اول درجے کے جریدوں کو بھیجتا اور اس

کے بعد کم تر درجے کے مدیروں کو۔ بڑے جریدوں اور رسائل میں سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ، سکرائبنرز، امریکن مرکری وغیرہ شامل ہیں، جو افسانے رسالے اشاعت کے لئے منظور کر لیتے ان پر دائرہ کھینچ دیتا اور جو واپس آ جاتا، اس پر ہلکی سی لکیر لگا دیتا اب اس کے لئے راستہ کھل گیا تھا۔

اس کا پہلا افسانہ جو کسی بڑے جریدے میں شائع ہوا وہ "ایملی کے لئے گلاب کا پھول" A ROSE FOR EMILY تھا، جسے فورم FORUM نے اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ جب کہ دوسرا افسانہ THRIFT سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ میں اور امریکن مرکری میں HONOR اور سکرائبنرز میں DROUTH شائع ہوا۔ لیکن اس دور کے بارے میں بھی خود فاکنر ہنستے ہوئے کہتا تھا کہ سینکڑوں افسانے اسے واپس ملتے ہیں، جس کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مگر اب اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے لگا تھا، اسے پوسٹ نے THRIFT پر ۷۵۰ ڈالر معاوضہ ادا کیا، جو اس کے ناولوں کے معاوضوں سے بھی زیادہ تھی۔ بعد ازاں سکرائبنرز نے بھی اسے اتنی ہی رقم ادا کیا۔ ستمبر کے مہینے میں پوسٹ نے اس کے مزید دو افسانے LIZARDS IN JAMSHYDS COUNTRY YARD اور RED LEAVES شائع کئے جس پر اسے ۷۵۰ ڈالر ملے۔

ان دنوں فاکنر کو کرایے کے اپارٹمنٹ میں رہنے کی بجائے اپنے گھر میں آباد ہونے کا شوق چرایا۔ اس نے ایک پرانی عمارت کو قرض پر خریدا، جس کی چھتیں اور فرش جا بجا ٹوٹے ہوئے تھے۔ فاکنر اور اسٹیل اپنے دونوں بچوں سمیت اس میں منتقل ہو گئے، اس وقت بھی گھر میں بجلی تھی نہ پانی کا انتظام اور نہ ہی اس کا سیوریج نظام ٹھیک تھا۔ کئی مہینے اپنے ہاتھوں سے کام کر کے اس نے اس گھر کو رہنے کے قابل بنایا اور پھر برسوں ادب سے ہونے والی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس پر خرچ کرتا رہا۔

۱۹۳۰ء میں سنکلیر لیوس نے ادب کا انعام حاصل کرتے ہوئے جو نوبیل تقریر کی، اس میں جن امریکی ناول نگاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا، ان میں فاکنر کا نام بھی شامل تھا اور "جو جنوبی امریکہ کو پرانے اور روایتی تنگنائے سے نکال کر جدید دنیا میں لانے کی جہد کر رہے تھے"۔ اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نئے ناشر پال رومین PAUL ROMAIN نے اسے کتاب شائع کرنے کی پیش کش کر دی۔

اسی دوران ہال سمتھ HAL SMITH نے، جس نے اس کا آخری ناول شائع کیا تھا، سنکچری SANCTUARY شائع کرنے کی پیشکش کی۔ ہال سمتھ اس سے قبل اس کی اشاعت سے انکار کر چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سنکچری شائع ہو گیا تو وہ اور مصنف دونوں جیل پہنچ جائیں گے، مگر بعد ازاں اس خیال سے کہ یہ ناول قارئین کا ایک بڑا حلقہ حاصل کرے گا، اس ناول کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس کی آمدنی سے وہ جو ناتھن کیپ اینڈ ہاریزن سمتھ کو نقصان سے بچالے گا جو ان دنوں سخت خسارے میں تھا۔ اوّل اوّل فاکنر راضی نہ ہوا۔ مگر بعد ازاں اس میں ترمیم کے بعد اس پر راضی ہو گیا۔

گو سنکچری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا، مگر فاکنر نے اسے شادی سے قبل ۱۹۲۹ء میں مکمل کر لیا تھا۔ بعض ناقدین نے اس کی شادی میں تاخیر اور اس کے اثرات کو اس ناول میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاکنر کی اپنی زندگی کے حوالے سے بلکہ عام معاشرتی روّیے کی نیابت میں ناول کا ارتقا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس نے ناول کو نہایت خوفناک علاقوں تک پہنچا دیا ہے۔ سنکچری میں جس طرح سوگوارانہ المیاتی اور بدفطرت فضا ابھرتی نظر آتی ہے، شاید ہی کسی اور ناول میں اسی طرح اجاگر ہوتی ہو۔ پورا ناول دنیائے قابوس نظر آتا ہے، جہاں قتل و غارت گری، جنسی ارزانی، اخلاقی گراوٹ اور بداطواری معاشرتی رگوں میں دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ ابتدا میں سنکچری کے حوالے سے بیان ہونے والی دہشتناک نیستی بالآخر

جنسی بنجر پن کے خوف کے خلاف جہد سے جا ملتی ہے۔ یہی جنسی بنجر پن جبلی توانائیوں کے علائق میں کلی نااہلیت کا ثبوت بن جاتے۔ کہیں کہیں مصنف کی ذات اور تادیر شادی سے محرومی کے اندر سے مستقبل میں خاوند اور باپ کی حیثیت سے ابھرتا ہیولا سنکچری کی جنسی بنجر پن کے ذریعے شیطانی واقعات کے پس منظر میں رشتہ استوار کرتے، گہری یاسیت اور مایوسی کا پس منظر بنتے محسوس ہوتا ہے۔ مگر مصنف کی اپنی زندگی کے ٹھوس تجربات، ناول کے کردار کی اندرونی پہچان اور ساخت سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی جنسی بنجر پن کا کوئی کمپلیکس COMPLEX مصنف کی زندگی میں غیر موجود ہے۔

سنکچری پر مصنف کی گرفت خوب ہے۔ اس نے پیکریت کی جاندار تکنیک کے ذریعے واقعات کو پورٹریٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ سنکچری ایک ایسا ناول ہے جسے کئی ناشرین نے معاشرتی خوف سے شائع نہ کیا مگر جب یہ ناول شائع ہو کر آیا تو اس پر جہاں بعض منفی تبصرے ہوتے، وہیں فاکنر کی ہنرکاری اور قوتِ اظہار کے ساتھ ساتھ اس کی تکنیک پر گرفت کو خوب سراہا گیا اور اسے اس کی کامیاب کوشش کہا گیا، دو ماہ کے اندر اندر اس کی سات ہزار کاپیاں فروخت ہو گئیں، اب فاکنر کے لئے ایک نیا راستہ کھل گیا تھا۔

ایک طرف اس کتاب کے قارئین میں اضافہ ہو رہا تھا، دوسری طرف اس کے اہلِ وطن آکسفورڈ کے لوگوں میں نہ صرف اشتعال پیدا ہو گیا بلکہ وہ بے عزتی پر اُتر آئے تھے۔ اسے نہایت عریاں، فحش اور بیہودہ ناول قرار دے رہے تھے۔ جنوری میں اس کے خاموش طبع والد نے الباما کے قبرستان میں جاکر دُعا کی کہ اس کی کتاب کو بازار میں فروخت پر پابندی لگا دی جائے۔ اگلے مہینے اس کے لئے اس نے عملی کوششیں بھی کیں مگر اس کی ماں ماڈ نے اس کے اظہار کے بغیر کہ اس نے ناول پڑھا ہے یا نہیں، اپنے بیٹے کے دفاع کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے فاکنر کے باپ سے کہا "اس نے وہی کچھ لکھا جو کچھ اس نے دیکھا ہے۔

لوگ طرح طرح کی باتیں کرکے اس کا راستہ روکنا چاہتے ہیں۔"

اس حوالے سے فاکنر کا یہ ناول آکسفورڈ میں اس کی مقبولیت کا باعث نہ بن سکا اور اس کے بھائی بھی اس پر سخت تنقید کرتے رہے۔ اس دوران اس کے کئی افسانے ملک کے چوٹی کے جریدوں میں اشاعت کے لئے قبول کر لئے گئے۔ اس کی توجہ اب بھی مکان کو زیادہ سے زیادہ آسودہ بنانے پر مرکوز تھی۔ اس سال کے اوائل میں اس کا بیٹا جان پیدا ہو کر مر گیا تھا جس کے سبب کئی ماہ تک گھر میں علاج کے اخراجات بھی زیادہ ہوئے تھے اور سینکچری کی رائلٹی کی پہلی قسط اسے ستمبر میں جا کر ملی۔ ستمبر میں اس نے "دی لائٹ ان اگست THE LIGHT IN AUGUST لکھنا شروع کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں اس نے ورجینیا میں ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کی، جس کے بعد وہ سات ہفتوں تک نیویارک میں مقیم رہا۔ اس دوران اس کی کمر میں درد ہوا، مگر وہ جلد ہی لکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے ان سات ہفتوں میں اس قدر رقم کمالی کہ مکان کے تمام قرضوں کے ساتھ دیگر کئی رُکے ہوئے کام بھی مکمل ہوئے، وہ اپنے ساتھ "لائٹ ان اگست" کا مسودہ بھی لے کر گیا تھا جس کی اشاعت پر کئی پبلشرز تیار تھے، اب اس کی وہ کہانیاں بھی، جن کی اشاعت کے لئے فاکنر مہینوں کوشش کرتا رہا تھا، اشاعت کے لئے پبلشر تقاضا کر رہا تھا، مگر اس نے اپنے پرانے دوست، جس نے اس کے بُرے وقتوں میں ساتھ دیا تھا۔ ہال سمتھ کے ساتھ نئی کتاب کا معاہدہ کرلیا اور آکسفورڈ واپس آ کر اپنا ناول مکمل کرنے لگا، جسے اس نے فروری ۳۲ء میں پبلشر کے حوالے کر دیا۔

اپریل میں اس نے ہالی وڈ کا رُخ کیا اور ایک معروف کمپنی سے چھ ہفتوں کا معاہدہ کر کے وہاں منتقل ہو گیا۔ ان چھ ہفتوں کے لئے اسے ۳ ہزار ڈالر حاصل ہوئے۔ اسی دوران ۷ اگست ۳۲ء کو اس کا والد مرے فاکنر دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہو گیا تو اسے ہالی وڈ سے آکسفورڈ

آنا پڑا۔ جہاں سے کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ ہالی وڈ آکر سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ سال کی آخری سہ ماہی میں جہاں اس کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں، وہیں اس کا ساتواں ناول "اگست میں روشنی" LIGHT IN AUGUST بھی شائع ہوکر آگیا۔

"اگست میں روشنی" ایک ایسا ناول ہے جسے بلاشبہ امریکی معاشرت کا نمائندہ ناول کہا جاسکتا ہے۔ یہ ناول اپنی ساخت میں متنوع معنوی ادراک کا حامل ہے۔ اس امر پر پہلے صفحات پر بات ہوچکی ہے کہ فاکنر ناول کی اس ضرورت کو سمجھتا ہے کہ ناول زمان و مکان کے پھیلاؤ اور معروضی کے جس پیچیدہ نیابت کا تقاضا کرتا ہے، وہ آکسفورڈ کے ٹھوس اور تخیلی پر ہردو علائق میں فاکنر کے تجربے کا حصہ ہے۔ چنانچہ اس نے جہاں اپنے ناولوں کو یوکن پاٹاٹافا جیسا جیتا جاگتا لینڈ سکیپ دیا، وہیں تاریخی تسلسل، تہذیبی ثروت اساطیری دروبست اور طویل زمانی سفر بھی نظر آتا ہے۔ فاکنر کا نیا ناول "اگست میں روشنی" اس کے پہلے ناولوں کی نسبت جو کہیں زمان و مکاں میں ایک ساتھ، کہیں زبانی نوکینل میں فروغ پاتے ہیں، یہ ناول صرف مکانی وظائف میں زندہ اور سانس لیتا محسوس ہوتا ہے" پادری ہائی ٹاور کے علاوہ جسے زمانہ برباد کردیتا ہے، فاکنر کا کوئی کردار زمانے سے واقف نہیں ہے۔ اور لینا گروو تو ماورائے زمانہ اقلیم میں رہتی ہے "یہ ابدیت بھی ہے اور پھر حاضر بھی"۔ ایک مخصوص جغرافیے کی کہانی ماضی کے جھروکوں میں جس طرح سفر کرتی ہے، وہ ایک ٹھوس مکانی ولدیت سے زیادہ اس تحرک پر دال ہے، جو لینا گروو کو لیوکاس کے تعاقب میں سفر پر مدام فعال رکھتا ہے۔ لینا گروو ایک غریب کھیت مزدور ہے، جس کے پیروں کے نیچے زمین موجود ہے، مگر لیوکاس جب اس کی کوکھ میں تخلیق کا بیج بوکر فرار ہوجاتا ہے، تو یہاں سے لینا گروو تحرک کی نامیاتی توانائی کے ساتھ زمانے کے آشوب میں اتر جاتی ہے۔ یہ سفر اس کی تخلیق کا سبب بھی بنتا ہے اور اسے مکمل عورت پن کے ساتھ شناخت بھی کراتا ہے

یہیں ہائی ٹاور اپنی جڑیں زمین میں پیوست رکھنے کے باوجود زمانے کے ہاتھوں تباہی کی مثال قائم کرتا ہے اور یوں کہانی جس قدر ٹھوس دکھائی دیتی ہے اس سے زیادہ علامتی سطح پر معنوی پھیلاؤ کا اظہار کرتی ہے۔" اگست کی روشنی" کے بارے میں اور اس کے کرداروں کے دوہرے پن کے حوالے سے نقاد اس کے علامتی اسلوب پر اتفاق کرتے ہیں۔

ہائی ٹاور، کرسمس، لینا گروو، لیوکاس سارے کردار جس قدر ٹھوس وجود رکھتے ہیں، اسی قدر علامتی علائق میں زندہ ہیں۔ اس ناول میں علامتیں دو قسم کی ہیں۔ پہلی سطح غیر شعوری طور پر علامتوں کے استعمال سے سامنے آتی ہے اور علامتوں کے استعمال کی دوسری جہت شعوری ہے۔ دوسری قسم کی علامتوں میں گہرائی کا مفقود اور اتھلی سطح نمایاں ہے۔ جیسے کرسمس کے کردار کو مسیح کی علامت بنانے کی کوشش غیر نامیاتی اور مجرد بن جاتی ہے۔ جبکہ پہلی قسم کی علامت میں تہہ داری، متنوع رنگ اور گہرا معنوی دلبساں سجا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں لینا گروو کو لیا جا سکتا ہے۔ لینا گروو کی نامیاتی علامت زندگی کے تلخ انجام یعنی موت اور فطرت سے گہری وابستگی کا شائستہ اظہار ہے، جہاں ظاہری سطح پر اس کا سارا تحرک RECOGNITION کی روایں پروان چڑھتا ہے جبکہ لینا گروو کے ظاہری وجود کے اندر دوسرے وجود کا سارا منظر نامہ صداقت، فطرت کی بالیدگی اور حسن و خیر کو اپنی ذات میں سمیٹنا لینا گروو کے حقیقی تجربوں کو حیات اور ماورائے حسیات ہر دو سطحوں پر اجاگر کرتا ہے۔ جس کی دوسری سطح زمانی البعاد TIME CONTINUUM میں تجدید فطرت سے وابستہ نظر آتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ ناول وقت کے دروبست میں زقند بھرتا ہائی ٹاور کے لئے تباہی اور موت کی علامت لے آتا ہے۔ جہاں خیر و شر کی آویزش، روشنی اور تاریکی کا تضاد، موت و حیات کی کشمکش علامتی دروبست میں متشکل ہوتی ہے۔ جو ٹھوس بھی ہے اور سیال

صورت میں بھی۔ اور یہی بات فاکنر کے ناول کو عظمت عطا کرتی ہے۔

۱۹۳۳ر ۳۴ر کا سال ولیم فاکنر کی فتوحات کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ گو مالی اعتبار سے وہ کبھی آسودہ نہ ہوا مگر اب اس کی اس قدر آمدنی ہو چکی تھی جس کے بارے میں شاید فاکنر نے کبھی پہلے سوچا بھی نہ ہو۔ فروری کے مہینے میں اس نے ہوا بازی کی تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ اب فاکنر ادبی طور پر، جہاں اپنی شہرت اور ناموری کی فضاؤں میں اوپر اور اوپر جا رہا تھا، وہیں اپنی حقیقی زندگی میں بھی فضاؤں کو تسخیر کرنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ ٹورنٹو میں پہلی سولو فلائٹ سے وہ اب تک زندگی میں بھی سولو فلائٹ کرتا آیا تھا۔ ادب کے تمام حلقوں میں اس کی ہنرکاری اور تخلیقی قوت تسلیم کی جانے لگی تھی۔ کئی پبلیشر اس کی کتابیں شائع کرنے کے خواہشمند تھے۔ ۲۰ر اپریل کو گرین بو GREEN BOUGH شائع ہوا۔ اسی سال اسے ایک خوشی ملی، اس کے ہاں جون میں بیٹی جِل فاکنر JILL پیدا ہوئی۔ سال کے آخر میں اس نے اپنے لئے ہوائی جہاز خریدا، ہوا کے دوش پر تیرنے کی آرزو اسے جنگِ عظیم دوم تک لے گئی تھی؛ مگر اس کے دیکھے خوابوں کی تعبیر کا وقت اب آیا تھا۔

۱۹۳۴ر میں اس کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں، جن میں ڈاکٹر مارٹینو بھی شامل تھا۔ ۱۹۳۵ر میں اس کا بھائی ڈین فوت ہو گیا۔ جس کی موت کا اس پر خاصی دیر تک اثر رہا۔

اب اس نے اپنی زندگی کے شاہکار ناول ابسلوم ابسلوم ABSOLOM ABSOLOM پر کام شروع کر دیا تھا۔ اس ناول کے بارے میں اس نے اپنے پبلیشر کو بتایا کہ یہ اس کے خاندان کے اتار چڑھاؤ کی کہانی ہے جو انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک کے حالات پر محیط ہے۔ سال کے وسط میں وہ پھر ہالی وڈ گیا، جہاں اس نے کئی مہینوں تک قیام کیا۔

نومبر ۱۹۳۵ر میں اس کا نیا ناول پائلن PYLON شائع ہوا اور ۱۹۳۶ر کی پہلی سہ ماہی

میں اس نے اپنا ناول ابسلوم ابسلوم مکمل کرلیا۔ یہیں اسے احساس ہوا کہ اسٹیل سے شادی کے بعد اس کی زیادہ تر توجہ پیسہ کمانے میں لگی رہی اور اس کا سبب اسٹیل کی ضرورتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ اس کی توجہ ایک خاتون میلٹا ڈورتھی MELTA DORTHY کی طرف ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ اس سال کا زیادہ عرصہ اس نے ہالی وڈ میں گزارا۔ ۲۶ر اکتوبر ۳۶ء میں ابسلوم ابسلوم شائع ہوا، جس کا نہ صرف ادبی حلقوں میں بلکہ پڑھنے والوں کے حلقوں میں بھی شاندار استقبال ہوا۔ جس کے بعد ایک اور بڑا ناول آن ونکوشڈ UNVENQUISHED ۱۵ر فروری ۳۸ء کو شائع ہوا جب کہ اگلے سال ۱۹ر جون کو اس کا نیا ناول دی وائلڈ پام THE WILD PALMS طبع ہوا اور اسی سال اس کی شہرت کا ایک اور سفر مکمل ہوا اور اسے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹر کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

۱۹۴۰ء میں دی ہملٹ THE HEMLET شائع ہوا۔ اور اس نے اپنی کہانیوں پر بھی خاصا کام کیا۔ اگلا سال بھی وہ اسی لگن سے کام کرتا رہا۔ جس کے نتیجے میں ۱۱ر مئی ۱۹۴۲ء کو نئی کتاب GO DOWN MOSES کے نام سے شائع ہوئی۔ آئندہ تین سال تک وہ ہالی وڈ میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۸ء کی آخری سہ ماہی (ستمبر اواخر) میں اس کی ایک اور کتاب INTER UNDDR IN DUST شائع ہوئی اور اسی سال اسے امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹر کا رکن بنا دیا گیا۔

اس دوران اس نے ادبی سطح پہ کوئی زیادہ تحرک کا مظاہرہ نہیں کیا، مگر ادبی حلقوں میں یہ بات گشت کرنے لگی کہ ادبی فلک الافلاک پہ فاکنر ایک ایسا نام بن گیا ہے جو کسی بھی بڑے انعام کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں یہ افواہ زیادہ سرگرم تھی مگر اس سال کسی کو بھی ادبی انعام نہیں ملا۔ مگر ۱۰ر نومبر ۱۹۵۰ء کی صبح نیویارک سے موصول

ہونے والے ٹیلی فون نے اسے ایک امریکی ادیب سے اٹھا کر دنیا کے چند بڑے خوش نصیب ادیبوں کی فہرست میں لا کھڑا کیا۔ اسے "ایک طاقتور، آزاد اور فنکارانہ صلاحیتوں سے رستاخیز" ایسا ادیب قرار دیتے ہوئے، جس نے "ادب کی دنیا میں غیر معمولی اضافہ" کیا اسے ۱۹۴۹ء کے نوبیل ادبی انعام کا مستحق قرار دے دیا گیا اور اس طرح سویڈش اکیڈمی کے مترجم مسٹر تھرسٹن جونسن کی ۱۹۴۶ء میں کی گئی پیش گوئی نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور بالآخر آکسفورڈ کی ناپسندیدہ "شخصیت" آکسفورڈ کے شاہین" کا مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک اس کا تخلیقی سفر مدام فعال رہا۔ ۱۹۵۳ء میں اس نے یورپ کی سیاحت کی ٹھانی اور ۱۹۵۴ء کا زیادہ عرصہ انگلستان، فرانس، سویڈن اور دیگر ممالک میں رہ کر گزارا۔ لیکن اپنا تخلیقی سفر کسی مقام پر رکنے نہیں دیا۔ اس کا ایمان تھا کہ اس کی ہر نئی تحریر پہلے سے بہتر ہے۔

۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء کے دوران وہ کچھ نہ لکھ سکا، مگر ۱۹۶۱ء میں دوبارہ لکھنے کی طرف مائل ہوا۔ اب موت کا ایک ان جانا خوف اس کے پیچھے چل نکلا تھا۔ اس دوران اس کے بہت سے جاننے والے عزیز رشتہ دار، دوست اور ادیب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ جن کی موت کی خبریں اس کے اعصاب پر منفی اثرات ڈال رہی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اس کا دوست ہیرالڈ اوبر، جنوری ۱۹۶۰ء میں ایبر کامیو، جولائی ۱۹۶۱ء میں ارنسٹ ہیمنگوے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو خود اس کی ماں ماڈ بٹلر فاکنر کی موت کی خبریں اسے مسلسل مضمحل کرتی رہیں۔

کامیو کی موت پر اس نے کامیو کو ایک ایسا شخص قرار دیا" وہ بعض ایسے سوالوں کے جواب بھی دیتا رہا ہے جو انسان نہیں جانتا۔"

اگست ۱۹۶۱ء میں اس نے اپنے نئے ناول پر تین چوتھائی کام مکمل کر لیا۔ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ ایک کامیاب مزاحیہ ناول ہوگا۔ جسے بعد ازاں دی ریور THE RIVER کے نام سے مکمل کیا۔

فاکنر کا زیادہ تر ادب تجرباتی اور نئی راہوں کی دریافت کے ساتھ سامنے آتے وہ ایک ایسا عظیم فن کار تھا، جس نے قلم کے محاذ پر تمام زندگی جہاد کی۔ بار بار واپس آنے والے اس کے تخلیقی فن پارے اس کے حوصلوں کو توڑ نہ سکے۔ وہ ایک ایسے آہنی ارادوں کا مالک تھا جس نے قلم کے ذریعے اپنے وجود کو نہ صرف ملکی سرحدوں میں بلکہ دنیا کے جغرافیے پر تسلیم کرایا اور جب ساری دنیا میں اس کے ادب کو ایک عظیم فن کے طور پر قبول کر لیا گیا، تو ۶ر جولائی ۱۹۶۲ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگیا اور دنیا ایک ایسے نابغۂ روزگار فنکار سے محروم ہوگئی، جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قلم کے نام لکھ دیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ جوزف بلاٹنر " ولیم فاکنر۔ اے بائیوگرافی " JOSEPH L. BLOTNER

جلد اوّل صفحہ : ۳۷۵ "WILLIAM FAULKNER WILLIAM FAULKNER REFERENCES

RANDOM HOUSE NEW YORK 1974

۲ اس کا نام اپنے دادا جے ڈبلیو ٹی فاکنر نے رکھا تھا۔ اس کے نام کے ہجے اور ہر دو طرح کئے جاتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں ولیم فاکنر برطانوی شاہی نضائیہ میں بھرتی ہوا، تو اس نے جہاں بہت سی غلط بیانیاں کیں، تاکہ خود کو برطانوی نژاد ثابت کر سکے، وہیں اپنے نام کے ہجے بھی تبدیل کیے۔
ولیم فاکنر کو گھر میں پیار سے بلی بھی کہتے تھے۔ (ا۔ر) بھی کہتے تھے اور یہ نام ساری زندگی میں اس کے لئے استعمال ہوتا رہا۔

۳ بعض جگہوں پر اس کی تاریخ پیدائش رپلے (مسی سپی) اکتوبر ۱۸۹۷ء بھی بتائی گئی ہے جو درست نہیں ہے اس کی آپ بیتی اور دیگر تمام سوانح میں اس کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۵ ستمبر ۱۸۹۷ء اور مقام البانے درست ہے بحوالہ " فاکنر اے بائیوگرافی " از جوزف بلاٹنر جلد اوّل صفحہ ۶۲ اور 20TH CENTURY AUTHOR از SFAINLEY J. KUMTZS چوتھا ایڈیشن صفحہ ۴۳۸۔

۴۔ جوزف بلاٹنر ایضاً صفحہ ۷۔

۵۔ جوزف بلاٹنز ایضاً صفحہ ۶۰

۶۔ ایضاً

۷۔ جورت برانٹ وٹن برگ بحوالہ جوزف بلاٹنز JODITH BRYNT WITTENBERG

۸۔ جارج سیرین اوڈیئل بحوالہ امریکی ناول رچرڈ چیز، ترجمہ وقار عظیم

۹۔ LYLE SAXAN بحوالہ جوزف بلانٹز صفحہ ۶۰۶

۱۰۔ رچرڈ چیز امریکی ناول صفحہ ۲۸۶

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً۔

Walliams Faulkner

Bibliography

Fiction

1924: The Marble Faun, (Boni & Liveright - NY)
1926: Soldiers Pay, (Boni & Liveright, New York.)
1927: Mosquitoes, (Boni & Liveright, New York)
1929: The Sound and the Fury, (Vintage Booni New York)
1929: Sartoris, (Harcourt, Brace and Company New York)
1930: As I lay Dying, (Random House New York)
1931: Sanctuary, (Jonathan Cape & Harrison Smith New York)
1931: These 13,
1931: Idyll in the Desert,
1932: Salmegundi,
1932: This Earth,
1932: Miss Zilphia Bant,
1932: Light in August,
1933: A Green Bough,
1934: Doctor Martino and Other Stories,
1935: Pylon, (Harrison Smith and Robert Haas, New York)
1936: Absalom, Absalom, (Random House New York)
1938: The Unvanquished, (Random House New York)
1939: The Wild Pams, (Random House New York)
1940: The Hamlet, (Random House New York)
1942: Go Down Moses, and Other Stories, (Random House New York)
1948: Intruder in the Dust (Random House New York)
1951: Requiem for a Nun (Random House New York)
1954: A Fable (Random House, New York)
1957: The Town (Random House New York)
1959: The Mansion (Random House New York)
1962: The Reivers (Random House New York)
1973: Flags in the Dust (Random House New York)

Detail of Publications

— Blotner, Joseph, ed. Selected Letters of William Faulkner, New York: Random House, 1977, Cited as Selected Letters.

— Cowley, Malcolm, ed. The Faulkner-Cowley File: Letters and Memories, 1944-1962, New York: Viking Press, 1966, Cited as Faulkner-Cowley File.

— Meriwether, James B., ed, "Faulkner's Correspondence with the Saturday Evening Post, "Mississippi Quarterly, 30(Summer 1977), 461-75, Cited by title.

— Meriwether, James B., ed. "Faulkner's Correspondence with Scriber's Magazine." Proof, 3(1973), 253-82, Cited by title.

References to interviews, public letters, speeches, and other miscellaneous writings, which I cite by title or shortened title, are to the following editions:

— Fant, Joseph L., and Robert Ashley, eds. Faulkner at West Point. New York: Random House, 1964.

— Gwynn, Frederick L., and Joseph Blotner, eds. Faulkner in the University Class Conferences at the University of Virginia, 1957-1958. Charlottesville: University of Virginia Press, 1959.

— Jelliffe, Robert A., ed. Faulkner at Nagano. Tokyo: Kenkyusha Ltd., 1956.

— Meriwether, James B., ed. Essays, Speeches & Public Letters. New York: Random House, 1966.

References to memories written by members of the Faulkner family or by friends and acquaintances, which I cite as separately noted, ar to the following editions:

— Cantwell, Robert. "The Faulkner's: Recollections of a Gifted Family," New World Writing, 2 (Nov. 1952), 300-315, Reprinted in F. J. Hoffman and Olga Vickery, eds., William Faulkner: Three Decades of Criticism, New York: Harcourt, Brace & World, 1963, pp. 51-66, Cited as Cantwell, "The Faulkner's."

— Cochran, Louis, "William Faulkner" A Personal Sketch." Memphis Commercial Appeal, 6 Nov. 1932, Reprinted in James B. Meriwether,

"Early Notices of Faulkner by Phil Stone and Louis Cochran," Mississippi Quarterly, 17 (Summer 1964), 136-64. Cited as Cochran, "Faulkner."

— Cullen, John B., with Floyed C. Watkins. Old Times in the Faulkner Country. Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1961. Cited as Cullen, Old Times.

— Faulkner, Murry C. The Faulkners of Mississippi: A Memoir. Baton Rouge: Louisiana State University Press, 1967, Cited as Faulkners of Mississippi.

— Faulkner, Jim, "Auntee Owned Two," Southern Review, 8 (Oct. 1972), 836-44, Cited as "Auntee Owned Two."

— Faulkner, John. My Brother Bill: An Affectionate Reminiscence, New York: Trident, 1963. Cited as My Brother Bill.

— Franklin, Malcolm A. "A Chrismas in Columbus." Mississippi Quarterly, 27 (Summer 1974), 319-22.

— Franklin, Malcolm A. Bitterweeds: Life with William Faulkner at Rowan Oak. Irving, Tex: The Society for the Study of Traditional Culture, 1977. Cited as Franklin, Bitterweeds.

— Green, A. Wigfall. "William Faulkner at Home." Sewanee Review, 40 (Summer 1932), 294-306, Cited as Green, "Faulkner."

— Stone, Phil. "William Faulkner: The Man and His Work." Oxford Magazine, 1 (1934). Reprinted in James B. Merriwether, "Early Notices of Faulkner by Phil Stone and Louis Cochran." Mississippi Quarterly, 17 (Summer 1964), 136-64, Cited as Stone, "Faulkner."

— Webb, James W., and A. Wigfall Green, eds. William Faulkner of Oxford. Baton Rouge: Louisiana State University Press, 1965, Cited as Faulkner of Oxford.

— Wells, Dean Faulkner, and Lawrence Wells. "The Trains Belonged to Everybody: Faulkner as Ghost Writer. "Southern Review, 12 (Autumn 1976), 864-71. Cited as Wells, "The Trains."

— Wilde, Meta Carpenter, and Orin Borsten. A Loving Gentleman: The Love Story of William Faulkner and Meta Carpenter. New York: Simon and Schuster, 1976. Cited as Wild and Borsten, A Loving Gentleman.

The following biographical studies, which I cite as separately noted, have proved especially helpful:

— Blotner, Joseph. Faulkner: A Biography, New York: Random House,

1974. Cited as Blotner, Faulkner.

— Collins, Carvel. "Faulkner at the University of Mississippi," which serves as an introduction to William Faulkner: Early Prose and Poetry, Boston: Little Brown and company, 1962, pp. 3-33. Cited as Collins, "Faulkner at the University of Mississippi."
— Collins, Carel. "Introduction," William Faulkner: New Orleans Sketches, New York: Random House, 1968, pp. xi-xxxiv. Cited as Collins, "Introduction," New Orleans Sketches.
— Coughlan, Robert. The Private World of William Faulkner, New York: Harper and Brothers, 1954. Cited as Coughlan, Private World.
— Gidley, M. "One Continuous Force: Notes on Faulkner's Extra-Literary Reading." Mississippi Quarterly, 23 (Summer 1970), 299-314. Cited as Gidley, "Faulkner's Extra-Literary Reading."
— Millgate, Michael. "The Career," in The Achievement of William Faulkner, New York: Random House, 1965, pp. 1-57. Cited as Millgate, "The Career."

Among the large number of critical studies of Faulkner's fiction, the following, which I cite as separately noted, have proved especially valuable:

— Beck, Warren, Man in Motion, Madison: University of Wisconsin Press, 1961. Cited as Beck, Man in Motion.
— Brooks, Cleanth. William Faulkner: The Yoknapatawpha Country. new Haven, Cann: Yale University Press, 1963, Cited as Brooks, Yoknapatawpha Country.
— Brooks, Cleanth, William Faulkner: Toward Yoknapatawpha and Beyond. New Haven, Conn: Yale University Press, 1978. Cited as Brooks, Toward Yoknapatawpha.
— Guerard, Albert J. The Triumph of the Novel: Dickens, Dostoyevsky, Faulkner, New York: Oxford University Press, 1976, Cited as Guerard, Triumph of the Novel.
— Howe, Irving, William Faulkner: A Critical Study. New York: Random House, 1952.
— Irwin, John T. Doubling & Incest/Repetition & Revenge: A Speculative Reading of Faulkner. Baltimore, Md. The Johns Hopkins University Press, 1975. Cited as Irwin, Doubling & Incest.
— Millgate, Michael. The Achievement of William Faulkner, New York: Random House, 1966. Cited as Millgate, Achievement.

— Morris, Wesley A. Friday's Footprint: Structuralism and the Articulated Text. Columbus: Ohio State University Press, 1979. Cited as Morris, Friday's Footprint.
— Reed, Joseph W., Jr. Faulkner's Narrative. New Haven, Conn: Yale University Press, 1973. Cited as Reed, Faulkner's Narrative.
— Richardson, H. Edward. William Faulkner: The Journey to Self-Discovery. Columbia. Mo. University Press, 1969. Cited as Richardson, Faulkner.

Requiem for a Nun: A Play from the Novel (with Ruth Ford), 1959;

The Mansion. 1959; The Rivers. 1962.

Carvel Collins collected Faulkner's apprentice writings in Early Prose and Poetry, Boston, 1962. James B. Meriwether edited Essays, Speeches, and Public Letters, New York, 1966. The Faulkner-Cowley File: Letters and Memories 1944-1962. ed. Melcolm Cowley, New York, 1966, is a revealing correspondence which began with Cowley's editing of the Viking Portable Faulkner.

The "authorised" biography, by Joseph Blotner, long opening chapter of Michael Millgate's The Achievement of William Faulkner, New York, 1966, serves to set the biographical record straight, Family history is available in two volumes of reminiscence: John Faulkner, My Brother Bill, New York, 1963; and Murry C. Faulkner, The Faulkner of Mississippi. Baton Rouge, La., 1967. William Faulkner of Oxford, Baton Rouge. La., 1965, is a gathering of reminiscences by more than 40 friends of the author. edited by James W. Webb and A. Wigfall Green. Old Times in the Faulkner Country, Chapel Hill, N.C., 1961, is a collaboration between John B. Cullen, who hunted with Faulkner, and Floyd C. Watkins, who assembled the book. H. Edward Richardson concentrates on the years 1913-1929 in William Faulkner: The journey to Self-Discovery, Columbia, Mo., 1969. Martin J. Dain, Faulkner's Country: Yoknapatawpha, New York. 1964, prints photographs taken in and around Oxford.

Of the more than 20 books on Faulkner's work in the last decade, four are generally considered invaluable: Cleanth Brooks, William Faulkner: The

Yoknapatawpha Country, New Haven, Conn., 1963, and Olga W. Vickery, The Novels of William Faulkner, Baton Rouge, La., 1959, rev. ed., 1964, for comprehensive surveys; Michael Millgate, The Achievement of William Faulkner, New York, 1966, for source studies and textual criticism; and Hyatt H. Waggoner, William Faulkner: From Jefferson to the world, Lexington, Ky., 1959, for Faulkner's artistic development, with an emphasis on Christian elements in the work. Two briefer surveys, Frederick Hoffman, William Faulkner, New York, 1961; and Lawrence R. Thompson, William Faulkner: An Introduction and Interpretation, New York, 1963; are designed for the student. More specialized studies include Warren Beck's brilliant discussion of the Snopes trilogy, Man in Motion, Madison, Wis., 1961; CcCharles H. Nilon, Faulkner and the Negro, Boulder, Colo., 1962; John L. Longley, Jr., The Tragic Mask: A Study of Faulkner's Heroes, Chapel Hill, N.C., 1963; John W. Hunt, William Faulkner: Art in Myth and Motion, Princeton, N.J., 1968; and Walter Brylowski, Faulkner's.

Three collections of interviews, lectures, and conferences are Faulkner in the University: Class Conference at the University of Virginia 1957-58, ed., Frederick L. Gwynn and Joseph L. Blotner, Charlottesville, Va., 1959; Faulkner at West Point, ed. Joseph L. Fant and Robert P, Ashley, New York, 1964; and Lion in the Garden: Interviews of william Faulkner, 1926-1962, ed. James B. Meriwether and Michael Millgate, New York, 1968.

Olympiam Laugh: Myth in the Novels, Detroit, Mich., 1968. Of the European studies, the best are Heinrich Straumann, William Faulkner, Frankfurt/Bonn, 1968; R. N. Raimbault, Faulkner, Paris, 1963; Monique Nathan, Faulkner par lui-meme, Paris, 1963; Mario Materassi, I romanzi di Faulkner, Rome, 1968; and Jean Weisgerber, Faulkner et Dostoievski: confluences et influences, Brussels, 1968.

Among the handbooks or guides to Faulkner, the most reliable is Robert W. Kirk and Marvin Klotz, Faulkner's People: A Complete Guide and Index to the Character in the Fiction of William Faulkner, Berkeley, Calif., 1963. More ambitious, but burdened with too much synopsis is Edmond L. Volpe's A Reader's Guide to William Faulkner, New York, 1964. Miscellaneous collections of criticism began with the 1951 volume edited

by Frederick J. Hoffman and Olga W. Vickery, now expanded into William Faulkner: Three Decades of Criticism: East Lansing, Mich., 1960. Equally useful is Faulkner: A Collection of Critical Essays, ed. Robert Penn Warren, Englewood Cliffs, N.J., 1966. The Spring, 1967, issue of Modern Fiction Studies is a William Faulkner number containing nine critical essays. The Mississippi Quarterly (Summer, 1969) is a William Faulkner special issue of eight critical articles.

General critical studies are George P. Garrett, Jr., "An Examination of the Poetry of William Faulkner," PULC, XVIII(1957), 124-135; Alfred Kazin, "The Stillness of Light in August," PR,XXIV(1957),519-538; C. Hugh Holman, "The Unity of Faulkner's Light in August," PMLA, LXXIII(1958), 155-166; George Monteiro, "Bankruptcy in Time: A Reading of William Faulkner's Pylon," TCL, IV (1958), 9-20; George Garrett, "Faulkner's Early Literacy Criticism," TSLL, I(1959), 3-10; Cecil D. Eby, "Faulkner and the Southwestern Humorists," Shen, XI (1959), 13-21: Floyd C. Watkins, "The Gentle Reader and Mr. Faulkner's Morals," GaR, XIII (1959), 68-75; idem, "William Faulkner in His Own Country," EUQ, XV (1959), 228-239; Loic Bouvard, "Conversation with William Faulkner," MFS, V (1959), 361-364; Percy C. Adams, "The Franco-American Faulkner," TSL, V (1960), 1-13; Robert M. Slabey, "Myth and Ritual in Light in August,: TSLL, II (1960), 328-349; Floyd C. Watkins, "William Faulkner, the Individual, and the World," GaR, XIV (1960), 238-247; George Sidney, "William Faulkner and Hollywood," ColQ, IX (1961), 367-377; Joseph Gold, "Delusion and Redemption in Faulkner's A Fable," MFS, VII (1961), 145-156; W. M. frohock, "Faulkner and the Roman Nouveau: An Interim Report," BuR, X (1962), 186-193; W. R. Moses, "The Limits of Yoknapathawpha Country," GaR, XVI (1962), 297-305; M. Thomas Inge, "William Faulkner and George Washington Harris: In the Tradition of Southwestern Humor," TSL, VII (1962), 47-59; Rudolf Haas, "Faulkner und die Humanitat, Univ., XVIII (1963), 347-362'Vida Marcovic, "Interview with Faulkner," TSLL, V (1964), 463-466; James B. Meriwether, "Early Notices of Faulkner by Phil Stone and Louis Cochran," MissQ, XVII (1964); George Garrett, "The Influence of William Faulkner," GaR, XVIII (1964), 419-427; Otis B. Wheeler, Some Uses of Folk Humor by Faulkner," MissQ, XVII (1964), 107-122. More recent studies are Maurice Edgar Coindreau, "The Faulkner I Knew," Shen, XVI (1965), 27-

35; Melvin Backman, "Sutpen and the South: A Study of Abbsalom, Absalom!," PMLA, LXXX (1965), 596-604; Gordon Price-Stephens, "The British Reception of William Faulkner — 1929—1962," MissQ, XVIII (1965), 119-200; Richard G. Stern, "Faulkner at Home," BA, XXXIX (1965), 409-411; Robert Penn Warren, "Faulkner: The South and the Negro," SoR, I (1965), 501-529; Charles Doyle, "The Moral World of William Faulkner," Ren, XIX (1966), 3-12; Joseph Blotner, "William Faulkner, Roving Ambassador," International Educational and Cultural Exchange (Summer, 1966), pp. 1-22; Jessie A. Coffee, Empty Steeples: Theme, Symbol, and Irony in Faulkner's Novels," ArQ, XXIII (1967), 197-206; Paul S. Walters, "Theory and Practice in Faulkner: The Sound and the Fury," ESA, X (1967), 22-39; Nancy D. Taylor, "The Dramatic Productions of Requiem for a Nun," MissQ, XX (1967), 123-134; Floyd C. Watkins, "Faulkner and His Critics," TSLL X (1968), 317-329; Reynolds Price, "Pylon: The Posture of Worship," Shen, XIX Leonard I. Kulseth, "Cincinnatus among the Snopses: The Role of Gavin Stevens," BSUF, X (1969), 28-34; James A. Winn, "Faulkner's Revisions—— A stylist at Work," AL,XLI (1969), 231-250; and William R. Ferris, Jr., "William Faulkner and Phil Stone: An Interview with Emily Stone," SAQ, LXVIII (1969), 536-542.

503. BIBLIOGRAPHY

Bibliographical study of Faulkner begins with James B. Meriwether's The Literary Career of William Faulkner, Princeton, N.J., 1961, a complement to his 1957 volume, William Faulkner: A Check List; and continues with Linton R. Massey's William Faulkner, Man Working, 1919—1962, Charlottesville, Va., 1968, a "catalogue of the William Faulkner Collections at the University of Virginia." Useful for sources in Joseph Blotner's William Faulkner's Library: A Catalogue, Charlottesville, Va., 1964. James B. Meriwehter, "William Faulkner," Fifteen Modern American Authors, ed. Jackson R. Bryer, Durham, N.C., 1969, pp. 175-210, is an authoritative bibliographical essay.

The most comprehensive listing of work about Faulkner is Maurice Beebe's Criticism of William Faulkner: A Selected Checklist," MFS, XIII (1967), 115-161. Still valuable is the more selective bibliography of

criticism appended to Frederick J. Hoffman and Olga W. Vickery, eds., William Faulkner: Three Decades of Criticism, East Lansing, Mich., 1960, pp. 393-428. Bibliography on French editions and surveys can be found in Stanley D. Woodworth, William Faulkner en France (1931-1952), Paris, 1959; and Monique Nathan, Faulkner par lui-meme, Paris, 1963.

BIOGRAPHY AND CRITICISM

Significant estimates of Faulkner's writing did not appear until the late twenties. Among the earliest are Evelyn Scott, On William Faulkner's "The Sound and the Fury," New York, 1929, 10 pp.; Granville Hicks, "The Past and the Future of William Faulkner," Booknan, LXXIV (1931), 14-24; Marshall L. Smith, "Faulkner of Mississippi," ibid., 411-417; Henry S. Canby, "The School of Cruelty," Sat. Rev. Lit., VII (1931), 673-674; Alan R. Thompson, "The Cult of Cruelty," Bookman, LXXIV (1932), 477-487; and A. Wigfall Green, "William Faulkner at Home," Sewanee Rev., XL (1932), 294-306.

Later studies are Pelham Edgar, The Art of the Novel, New York, 1933, pp. 338-351; Morris U. Schappes, "Faulkner as Poet," Poetry, XLIII (1933), 48-52; "William Faulkner, the Moralist with a Corn Cob," in Wyndham Lewis, Men Without Art, London, 1934, pp. 42-64; Harry Hartwick, The Foreground of American Fiction, New York, 1934, pp. 160-166; Lawrence S. Kubie, "William Faulkner's Sanctuary: An Analysis," Sat. Rev. Lit. A: (Oct. 20, 1934), 218,224-226—an extended study; "Counterpoint: Light in August," in James W. Linna and Houghton W. Taylor, A Foreword to Fiction, New York, 1935, pp. 144-157; Harlan Hatcher, Creating the Modern American Novel, New York, 1935, pp. 234-243; Maurice Le Breton, "Technique et Psychologie chez William Faulkner," Etudes Anglaises, I (1937), 418-438; C. John McCole, Lucifer at Large, London, 1937, pp. 203-228; and George M. O'Donnell, "Faulkner's Mythology," Kenyon Rev. I(1939), 285-299.

Among more recent criticism are Percy H. Boynton, America in Contemporary Fiction, Chicago, 1940, pp. 103-112; Burton Rascoe, "Faulkner's New York Critics," Amer. Mercury, L (1940), 243-247; Warren Beck, Faulkner and the south," Antioch Rev., I (1941), 82-94; idem, "Faulkner's Point of View," College Eng., II (1941), 736-749; idem,

"A Note on Faulkner's Style," Rocky Mt. Rev., VI (1942), 5-14; Delmore Schwartz, "The Fiction of William Faulkner," Southern Rev., VII (1941), 145-160; "William Faulkner: The Negro and the Female," in Maxwell Geismar, Writers in Crisis, Boston, 1942, pp. 141-184—the most comprehensive sutyd to date; and John M. Maclachlan, "William Faulkner and the southern Folk," southern Folklore Quar., IX (1945), 153-167. Two useful re-appraisals by Malcolm Cowley are "william Faulkner Revisited," Sat. Rev. Lit., Apr. 14, 1945, pp. 13-16; and George Snell, "the Fury of William Faulkner," Western Rev., XI (autumn, 1946), 29-40.

The fullest bibliographical listing to date is Robert W. Daniel, A Catalogue of the Writings of William Faulkner, New Haven, 1942, 32 pp. Earlier listings are Aubrety Stark, "An American Comedy: An Introduction to a Bibliography of William Faulkner," Colophon, Pt. 19 (1934), 12 pp.; and Fred B. Millett, Contemporary American Authors, New York, 1940, pp. 346-348—useful for books and articles about Faulkner.

موت کے تعاقب میں عظیم کہانی کار

ارنسٹ ہمینگوے

موت کو زندگی میں اور زندگی کو عالم نزع میں دیکھنے کا اگر کسی کو گیان حاصل ہے، تو وہ بلاشبہ امریکی ادب میں اپنے عصر کا سب سے بڑا کہانی کار ارنسٹ ملر ہمینگوے ہے۔ جنگ عظیم کی ہولناکیوں میں گھری ہوئی زندگی کی بے توقیری، بے ثباتی، عدم تحفظ اور موت کے رقص نے، جو خود اس کے جسم اور روح پر برپا ہوا، اس نے ارنسٹ کو ایک ایمبولنس ڈرایئور سے دنیا کا ایک عظیم ادیب بننے کے لئے ایک لمحہ تخلیق سے روشناس کرایا، جس کے سبب وہ ایک ربع صدی بعد دنیا کے ادب میں مقام عالیہ کا جائز حقدار سمجھا جاتا ہے۔

ارنسٹ ملر ہمینگوے ۲۱ر جولائی ۱۸۹۹ء میں ۴۳۹ نارتھ اوک پارک ایونیو (نزد شکاگو) میں صبح کے ۸ بجے پیدا ہوا۔ اس کے والد کلیرنس ایڈمنڈز ہمینگوے CLEARANCE EDMONDS HEMINGWAY ایک دیہی معالج تھے اور ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری کے حامل۔ والدہ گریس ہال GRACE HALL موسیقی کی ٹیچر تھیں۔ ارنسٹ کے دادا اینسن ہمینگوے اور سر ہال امریکی خانہ جنگی کے دور میں باقاعدہ جنگوں میں حصہ لے چکے تھے، چنانچہ ارنسٹ ہمینگوے نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ جنگ کی تباہ کاریوں اور نفسیات

کے علاقے سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا، اور جو ارنسٹ تک لاشعوری طور پر منتقل ہوتی نسلِ آتی ہیں، جس نے بالآخر گھر سے بھاگ کر اسے جنگِ عظیم اول کے میدان تک پہنچا دیا تھا۔

ارنسٹ ہیمینگوے ابھی سات ہفتوں کا ہی ہوا تھا، کہ زندگی کے شروع ہوتے سفر کے ساتھ اسے ایک مشکل اور تھکا دینے والے سفر پر روانہ ہونا پڑا، جو اس معصوم بچّے کے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ستمبر کے اوائل میں جب موسم اپنی شدت کی انتہاؤں پر تھا، اس کے دادا نے فیصلہ کیا کہ وہ بیر جھیل کا سفر کریں وہ وہاں گرمیوں کے لئے ایک گھر بنانا چاہتے تھے۔ اہلِ خانہ پر مشتمل یہ قافلہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں اوک پارک کے گاؤں ایلی نوئز ILLINOIS سے ٹرین کے ذریعے شکاگو روانہ ہوا جہاں سے انہوں نے گھوڑا گاڑی سے مشی گن جھیل تک سفر کیا۔ مشی گن کے بعد سٹیمر کے ذریعے ٹریوانز کی چھوٹی بندرگاہ ہاربر سپرنگ تک پہنچے۔ جہاں سے آگے خمدار رستوں پر چھوٹی ریلوے لائن پر پٹوسکی تک چھوٹی ٹرین میں فاصلہ طے کیا اور پھر بیر جھیل BEAR LAKE جا پہنچے۔ جہاں ڈاکٹر ایڈمنڈ ہیمینگوے نے زمین خریدی تھی اور یہاں ٹھہر کر تعمیر کی نگرانی کرنا چاہتے تھے۔ گو اس سفر میں ارنسٹ ہیمینگوے شعوری طور پر تو شریک نہ تھا، مگر بعد میں جب بار بار اس سفر کی کہانی اس کے سامنے آئی تو لاشعوری طور پر اس نے اس سفر سے حظ اٹھایا اور سفر کرنے کی ایک خواہش ہمیشہ اس کے اندر مچلتی رہی۔

۱۳ جولائی ۱۹۰۰ء میں جب اس کی پہلی سالگرہ میں ۸ دن باقی تھے، اس نے زمین پر قدم جما کر چلنے کی کوشش کی۔ توازن برقرار رکھنے اور گرنے سے خود کو بچانے کی طرف یہ اس کی پہلی سعی تھی۔ اس کی والدہ نے جو پہلے ایک بیٹی مارسلین کی ماں تھی، ارنسٹ پر بہت توجہ دی۔ وہ دو سال کی عمر میں گول صحت مند اور خوش طبع بچہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے

وہ پانچ سال کا ہوا۔ میں اسے ترقی کھلونا سمجھتا اور وہ اس کی تردید کرتے ہوئے پونی بل بن گیا۔

گریس نے اسے بہ پہلی تصویری کتاب لا کر دی، وہ BOOK OF NATURE تھی۔ وہ

سے اس نے اپنے ارد گرد کی چیزوں سے آشنائی کی ابتدا کی۔ اس کو گھر میں مختلف ناموں سے

پکارا جاتا کوئی اسے پنچ PINCH کہتا، کوئی چپ منک CHIPMUNK اور

کوئی بوبی۔ اس میں ضد اور اپنی بات منوانے کی عادت زندگی کے نہایت آغاز میں نظر آتی

ہے۔ خواہش کرنا اور پوری نہ ہونے پر ناخوشگوار ہو جانا اس کی عادت بن گیا تھا۔ جب اپریل

۱۹۰۲ء میں اس کی بہن پیدا ہوئی تو وہ بھائی کی پیدائش کا کئی دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

بہن کی پیدائش پر وہ آزردہ ہو گیا اور کہنے لگا "مجھے یقین ہے کہ میرے بھائی کو بھی

ضرور خدا بھیجے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس کی تیسری سالگرہ بیئر جھیل پر منائی

گئی۔ ۱۹۰۳ء میں اسے کنڈر گارٹن میں داخل کرا دیا گیا، جہاں ۵ سال کی عمر میں اس کا پہلا

دوست ۱۱ سالہ ویسلے ڈلورتھ WISLEY DILWART بنا۔

۱۹۰۵ء میں اس کے نانا مسٹر ہال کا انتقال ہو گیا تو اس کی والدہ نے اپنا مکان فروخت

کر دیا اور کرائے کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے جو اوک پارک میں پبلک لائبریری سے

متصل تھا۔ اسی دوران گریس نے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے پرانے پیشے موسیقی

کی ٹیچر کی حیثیت سے دوبارہ کام شروع کر دیا۔

یہاں آنے کے بعد ارنسٹ کی لاشعوری تربیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایک ہی گھر

میں فن اور سائنس اس کے پاس موجود تھے۔ دوسری منزل پر ماں کی موسیقی اور ریاضت کا کمرہ

تھا، جہاں سے نرم سُروں میں ماں کی آواز اس کے اندر جادو جگاتی رہتی۔ گراؤنڈ فلور پر اس

کے باپ کی لیبارٹری، کلینک اور تحقیقی کمرے تھے جہاں سے دواؤں کی بو اور تحقیقی

جذباتی آوازیں اس کے اندر تجسس کو بیدار کرتیں۔ گھر سے باہر لائبریری تھی۔ جہاں کتابیں

کی بڑی بڑی الماریاں ہمہ وقت اس کے ذہن کو انگیخت رکھتیں اور زندگی کو سفر اور ایڈونچر سے ہمکنار کرنے کے لئے وہ سفر تھے، جو وہ اپنے باپ کے ساتھ کرتا۔ اس کا باپ شکار کا شوقین بھی تھا۔ اس نے دو سال کی عمر میں مچھلیاں پکڑنے کی چرخی اسے تھما دی تھی اور ۸ سال کی عمر میں شکاری بندوق کی لبلبی پر پہلی بار انگلی رکھی۔ اس کی زندگی میں متنوع پہلو اور رنگارنگی اس میں ایک ایسا اعتماد بحال کر رہی تھی جس پر آگے بڑھ کر اس نے اپنے مستقبل کی بنیادیں رکھنی تھیں۔

۶ سال کی عمر میں اسے اوک پارک پبلک سکول میں داخل کرا دیا گیا، جہاں سے اس نے ۷ ۔ ۱۹۰۶ء میں دوسرے درجے اور ۱۲ ۔ ۱۹۱۲ء میں آٹھویں درجے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس دوران اس کا فطرت سے ہم آہنگی کا سفر بھی جاری تھا۔ وہ روزانہ دودھ لینے قریب کے فارم میں جاتا، جہاں گھر اور فارم کے درمیان ایک باغ تھا جس میں انناس کے درخت تھے، جن کی شاخیں پگڈنڈی تک پھیلی ہوئی تھیں، وہ اس سے لطف اٹھاتا اور دوڑتا، کھیلتا گزرتا۔ ایک روز جب وہ باغ میں سے گزر رہا تھا، انناس کے درخت کی ایک سوکھی شاخ اس کے منہ میں داخل ہو گئی اور اندر سے اس کے حلق کو زخمی کر دیا۔ وہ اس کاری ضرب سے تڑپ کر گرا، مگر اس کا باپ قریب ہی تھا جس نے فوری طور پر طبی امداد مہیا کر دی۔ ان دنوں اس کے خاندان کے لوگ ونڈیئر میں رہائش پذیر تھے، جبکہ ڈاکٹر ایڈمنڈز اپنے بیٹے کے ساتھ مشی گن میں رہتا تھا اور اپنا مطب بدستور اوک پارک میں چلا رہا تھا۔ وہ روزانہ سیر کو جاتے، مچھلیوں کا شکار کرتے اور اونچے اونچے درختوں سے ٹیک لگا کر اس کا باپ اسے گیت سناتا۔

اس کی ماں اور باپ کے درمیان رفتہ رفتہ اونچی ہوتی اختلافات کی دیوار اس کے نفسیاتی دروبست میں الجھنوں کو جنم دے رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اس کا والد سپیشلائزیشن کورس کے لئے نیویارک چلا گیا۔ اس کا نیویارک کا سفر ارنسٹ کے دل میں سفر کی خوبیاں

بن کر ابھرنے لگا۔ اس نے ایسی کہانیوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا، جس میں سفر ہوتا۔ اس کی نویں سالگرہ پر اسے جو تحفہ ملا، اس میں ڈکنز کے بچوں کے ناول اور کہانیاں بھی تھیں۔ ۱۹۱۰ء میں اس نے پہلی بار ماں کے ساتھ ایک لمبا سفر کیا جس میں ریل گاڑی اور سٹیمر بھی شامل تھا اور اس سفر میں اس نے پہلی بار سمندر دیکھا۔ اس پر وسعت اور پھیلاؤ کا احساس پیدا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے پہلی بار عبادت کے لئے خود کو ذہنی اور شعوری طور پر آمادہ پایا۔ یہیں اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کی طرح ایک ڈاکٹر بنے گا اور لوگوں کا علاج کر کے خوشی محسوس کرے گا۔

ایک عجیب بات تھی کہ ارنسٹ کے اندر یہ خواہش بڑی شدت کے ساتھ اجاگر تھی کہ اس کا بھائی پیدا ہو، مگر جب ۱۹۱۱ء میں اس کی چوتھی بہن کیرول پیدا ہوئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی لیکن بہن کی پیدائش کے دو روز کے بعد جب اس کی ۱۲ویں سالگرہ منائی گئی تو وہ بہت خوش تھا۔

ارنسٹ ہمینگوے میں بچپن سے ایک عادت زور پا گئی تھی، وہ ہر بات کا بتنگڑ بنانے اور ڈرامائز کر کے پیش کرنے کا رجحان تھا۔ ذرا ذرا بات کی کہانیاں گھڑ لیتا اور اس میں ہیرو پیدا کر کے اپنے اندر ہیرو شپ کی خواہش پوری کرتا۔ یہی خواہش اسے سکول ڈرامے تک لے آئی اور ساتویں درجے میں اس نے پہلی بار رابن ہڈ ڈرامے میں کام کیا۔ جو ۱۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو گرجا گھر میں پیش کیا گیا۔ اب وہ سیر اور شکار کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل میں چلا جاتا۔ ان ہی دنوں وہ ہائی سکول میں پہنچ گیا اور ۱۴ سال کی عمر میں اس نے نہایت اعلیٰ درجے میں گرامر سکول سے امتحان پاس کر لیا۔ جس پر تمام گھر والوں نے اسے بے شمار تحائف دیئے۔ وہ تیزی سے جوانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وہ محنت کے کاموں کو پسند کرنے لگا جو اس کے باپ کے نزدیک نہایت خوش کن تھا۔ اس

نے سائنس اور فن میں دلچسپی لینا اپنے گھر میں سیکھا تھا۔ فطرت سے محبت کا درس اپنے اوک پارک کے دیہاتوں، درختوں، جھیلوں اور جنگلوں سے ملا، وہ ایک جینئس نوجوان تھا۔ علم کے بڑھتے ہوئے دروبست نے اس کے اندر "باغی ارنسٹ" کی ترویج شروع کر دی تھی، جس کا لازمی نتیجے کے طور پر مروجہ اخلاقی قدروں اور مذہبی تعصبانہ رویوں کے خلاف ایک جذبہ بیدار ہونے لگا جو وقت کے گزرتے لمحوں میں توانا ہوتا گیا۔

۱۴ سال کی عمر میں ہائی سکول میں داخل ہونے کے بعد گرامر سکول کی نسبت اسے بڑا میدان ملا۔ اس نے الجبرا، لاطینی، انگریزی اور جنرل سائنس میں داخلہ لیا، پہلے سال اسے لاطینی مشکل معلوم ہوئی، جیسا کہ اس کی ماں کو پہلے سال مشکل لگی تھی۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے شعور پر ماں کی چھاپ گہری تھی۔

۱۶ سال کی عمر میں وہ طویل القامت، مضبوط جسم اور خوبصورت نوجوان نکلا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑا نظر آتا۔ گرامر سکول سے کامیابی کے بعد ہائی سکول سے اس کی کامیابیوں کا ایک بڑا جہاں موجود تھا۔ اس نے کھیل اور کتاب میں یکساں دلچسپی لینی شروع کی۔ اب لکھنا بھی شروع کر دیا اور کھیل میں اپنی صلاحیتوں کا مناسب اظہار بھی کرنے لگا۔ وہ سکول فٹ بال ٹیم میں منتخب کر لیا گیا۔ یہیں سے اسے باکسنگ کا شوق چرایا اور اس نے باکسنگ کی تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ کہانیاں لکھنے کا آغاز بھی ہو گیا۔ اس کی پہلی کہانی ۱۹۱۶ء میں سکول میگزین میں شائع ہوئی، جبکہ دوسری کہانی بھی اپریل ۱۹۱۶ء میں THE MATTER COLOUR طبع ہوئی جس کے کردار باکسنگ کے میدان سے منتخب کئے گئے تھے۔ ان ہی دنوں اس نے اوک پارک کے سکول کے ہفتہ وار جریدے ٹریپیس TROOPAZ میں رپورٹنگ کرنے لگا۔ ۱۹۱۷ء میں اس کا پہلا طنزیہ کالم ٹریبون میں شائع ہوا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس دور میں کیمپنگ، ہائیکنگ اور شکار اس

کے مرغوب مشاغل تھے۔

کیمپنگ کے دوران ایک بار اسے عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے قریب دریا کے کنارے جنگل میں خیمہ لگائے تفریح میں مشغول تھا کہ اچانک ان پر آوارہ گردوں کے گروہ نے حملہ کر دیا، ان کی چھولداریاں اکھاڑ دیں اور سامان دریا میں پھینک دیا۔ اس اچانک حملے سے تمام لڑکے گھبرائے، مگر ارنسٹ ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ حملہ آوروں کے ہاتھ میں چمکدار کلہاڑیاں تھیں، تین حملہ آور ارنسٹ پر ٹوٹ پڑے۔ ارنسٹ نے بڑی بہادری سے ان کا نہ صرف مقابلہ کیا، بلکہ جلد ہی انہیں دریا کے دلدلی کناروں میں دھکیل دیا۔ لیکن جلد ہی انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ یہ آوارہ گردوں کا گروہ نہ تھا بلکہ یہ انہی کے سکول کے سینیئر جماعتوں کے لڑکے تھے اور تفریحاً ان پر ٹوٹ پڑے تھے، جب اس واقعہ کو شکاگو ٹریبیون میں رپورٹ کیا تو اخبار میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا کہ اگر وہ کلہاڑی ارنسٹ کو لگ جاتی تو کیا ہوتا۔ خاصی بحث کے بعد ارنسٹ نے خود یہ ثابت کیا کہ یہ ایک دلچسپ مذاق تھا۔

۸ جون ۱۹۱۷ء کو اس کی زندگی کا ایک خوشگوار دن تھا، جب وہ سینیئر کلاس کا امتحان (گریجویشن) پاس کرنے کے بعد جا رہا تھا اور سکول کے ساتھی اپنے ایک ادیب اور کھلاڑی دوست کو پھولوں کے سائے میں رخصت کرنے اکٹھے ہوتے تھے یہاں اصلاً ارنسٹ کی زندگی کا خوبصورت آغاز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

گریجویشن کے بعد ارنسٹ کے پاس تین راستے تھے۔ کالج۔ جنگ۔ یا کوئی کام — کالج جانے کے حق میں نہ تھا۔ باپ جنگ میں شرکت پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے شکاگو ٹریبیون میں ملازمت کا فیصلہ کیا مگر ملازمت کے لئے اسے اکتوبر کا انتظار کرنا تھا۔ ارنسٹ جلد سے جلد گھر سے باہر جا کر زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا

تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ وہ کالج جائے اور میڈیسن میں داخلہ لے اور طبی پیشہ اختیار کرے۔ ماں اُسے موسیقی کی تربیت دلوانا چاہتی تھی لیکن وہ دونوں سے سمجھوتہ نہ کر سکا۔ اب گھر میں ایک نامعلوم سی کشیدگی در آئی تھی۔ چار ماہ اس نے بڑی مشکل سے گزارے اور اکتوبر میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے گھر سے روانہ ہوا۔ ٹرین پر سوار کرتے ہوئے ڈاکٹر ہیمنگوے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

باپ کی آواز ٹرین کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کی ہمسفر رہی۔ کنساس سٹی سٹار اخبار میں کام کرنے کے چند ہی ماہ بعد اس نے ایک اور نوجوان کے ساتھ مل کر جنگ میں جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایمبولینس ڈرائیور کی حیثیت سے ہلال احمر میں درخواست دے دی۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں اس نے ٹریبون سے آخری تنخواہ لی اور اوک پارک واپس آگیا۔ جہاں سے جنگ پر بلاوے کے ساتھ ہی نیویارک اور نیویارک سے فرانس پہنچا۔ جہاں اس نے جنگ کے کئی ماہ گزارے۔ بعد ازاں وہ یونٹ کے ساتھ اٹلی چلا آیا اور ایک محاذ پر دشمن کی شدید گولہ باری کے نتیجے میں ٹانگ زخمی ہونے پر ہسپتال پہنچ گیا۔ جنگ میں داخل ہونے پر زخمی ہونے کے بعد جب اس نے اپنے چاروں طرف لاشیں کراہتے، چیختے بے بس انسان اور لاشوں پر مردار روں کو منڈلاتے دیکھا، تو زندگی سے اس کا اعتماد اُٹھ گیا۔ وہ کہتا ہے جنگ انسان کو وہ نہیں رہنے دیتی جو وہ جنگ سے پہلے ہوتا ہے۔ یہاں اس کی کئی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی اور اس نے جنگ کی تباہ کاریوں میں انسان کی بے توقیری کو بے راہروی میں گھول کر پینے کی کوشش کی۔ یہیں اس کی ملاقات ایک اطالوی لڑکی اجنیس AGNES سے ہوئی۔ جس کے بعد ازاں اثرات اس کے ادب میں بھی ملتے ہیں۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں وہ مختلف ملکوں سے ہوتا ہوا اوک پارک پہنچ گیا۔ جہاں اس کے سرجن باپ نے زخمی گھٹنے کا علاج کیا اور سال کے آواخر تک وہ چلنے کے قابل ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے باقاعدہ کہانی کاری کا آغاز کیا اور اس کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں۔ اب وہ اپنے فارم میں کام کرنے لگا۔ اس کی طبیعت میں آوارگی اور عیش پرستی، جنگ کی بے معنویت کے نتیجے میں در آئی تھی۔

۱۹۲۰ء میں ایک بار اس کی ماں سخت بیمار تھی۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک خوبصورت لڑکی تعینات ہوئی۔ یہ لڑکی الزبتھ ہیڈلے رچرڈسن تھی۔ ہیڈلے سے ارنسٹ کی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات محبت بالآخر ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ازدواجی زندگی کے آغاز پر ختم ہوئی۔ اسی سال دسمبر میں انہوں نے امریکہ چھوڑ کر فرانس میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا اور ۹ جنوری ۱۹۲۲ء میں پیٹاسکی کے مقام پر رہائش اختیار کر لی۔

فرانس پہنچنے کے بعد اس کی سنجیدہ زندگی کا آغاز ایک نئے دھارے میں شروع ہوا۔ یہاں اس کا نکتہ نظر بھی واضح ہونے لگا، اس نے اپنی ذات سے عہد کیا کہ وہ اپنا ایک ایک جملہ حق اور صداقت سے تحریر کرے گا۔ یہاں اس کے اپنے دو افسانے THE PASSING OF PICKLE MECORTEY اور WALVES AND DOUGH NUTS کو دوبارہ لکھا جسے اس کے حلقے میں بڑا پسند کیا گیا۔

فرانس میں یہ خیال عام تھا کہ ادب لکھنے کے لئے ہوٹل کا کمرہ ضروری ہے۔ چنانچہ ارنسٹ نے اس ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں فرانس کا ممتاز دانشور اور نقاد PAUL VERLSIN نے ٹھیک ۲۵ سال قبل اپنی زندگی کا آخری سفر طے کیا تھا۔ ہوٹل میں لکھنے کے تصور کو بودلیر سختی سے رد کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تخلیق کے لئے ہوٹل کا کمرہ ضروری نہیں۔

پیرس میں رہائش کے دوران اس نے اپنے دوست GETRUDE STEIN کی معرفت (جو ان دنوں امریکہ میں تھا) ایذرا پاؤنڈ سے ملنے کا وقت لیا اور وہ شام یقیناً اس کے لئے نہایت خوشگوار تھی جب وہ ایذرا کے گرومی سٹوڈیو میں اس کے ہاں چائے پر مدعو تھے۔ ڈوروتھی ایذرا چائے دے رہی تھی اور ایذرا کپ پر کپ انڈیل رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی باتوں کی شدت اور روانی بھی جاری تھی۔ اس کا ہاتھ کرسی کی ہتھی پر باتوں کے ساتھ رقص کرتا۔ ارنسٹ نے بہت کم گفتگو کی۔ زیادہ تر وہ ایذرا کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن وہ ایذرا سے پہلی ملاقات میں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس نے سٹین کو خط لکھتے ہوئے ایذرا کا مذاق اڑایا اور اسے "باتونی بوہیمین" قرار دیا۔ اس کے بال بکھرے، داڑھی بے ترتیب اور کالر استری سے بے نیاز تھے۔

ایذرا پاؤنڈ نے اس کی شاعری کو پسند کیا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ اتنا اچھا شعر کہنے والا شخص بارکسنگ میں کیا تلاش کر رہا ہے۔ ایذرا نے اس کی کچھ نظمیں اور ایک افسانہ ایک ادبی جریدے THE LITTLE REVIEW کے لئے منتخب کیا۔ مگر شومئی قسمت کہ وہ ایڈیٹر کو پسند نہ آئے تو اس نے ایک بار پھر سٹین کو طنزیہ خط لکھا کہ میں آج تمہارے دوست ایذرا کی "مدیرانہ صلاحیتوں کا قائل ہو گیا ہوں، وہ آج کل مجھے شاعری پڑھا رہا ہے اور میں اسے باکسنگ"۔

۱۹۲۲ء میں وہ ٹورنٹو کے جریدے سٹار کے لئے باقاعدہ رپورٹنگ کرنے لگا۔ اسی دوران اسے اٹلی کے دورے کا موقع ملا۔ میلان میں قیام کے دوران اسے معلوم ہوا کہ بلیک شرٹ تنظیم کا نوجوان رہنما مسولینی آیا ہوا ہے جہاں ایک اخبار کے دفتر میں اس سے ملاقات ہوئی اور اس نے مسولینی کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔

۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء میں اسے اخبار کی طرف سے لاسان LAUSANNE کی امن

کانفرنس میں شرکت کے لئے بھیجا گیا، جو ترکی اور یونان میں تخریب کاری کے واقعات کو ختم کرانے کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ اسی دورے کے دوران ۱۹۲۳ء میں اس نے سپین بھی دیکھا۔

۱۹۲۳ء میں اسٹار کا مدیر تبدیل ہوا، تو اس کو پیرس سے باہر رپورٹنگ کے لئے منتخب کیا گیا اور پہلی ڈیوٹی امریکہ میں برطانوی وزیر اعظم کی کوریج کی تھی۔ ابھی وہ روانہ نہ ہوا تھا کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام جان ہیڈلے ہیمنگوے رکھا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی پہلی کتاب "تین کہانیاں اور دس نظمیں" THREE SHORT STORIES AND TEN POEMS شائع ہوئی، مگر اس مجموعے کا RESPONSE بہت کمزور رہا۔ خاص طور پر امریکہ میں اس کتاب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے جریدے TROPEZE میں اس پر تبصرہ شائع ہو جائے اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس عصر کے ایک بڑے نقاد ایڈمنڈ ولسن نے بہر حال اس کی کوشش کو سراہا۔ لیکن اس کی کہانی جو اس مجموعے میں شامل تھی MY OLD MAN کو شیروڈ اینڈرسن SHIRWOOD ANDERSON کی کہانی RACE TRACK سے مماثل قرار دیا۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۲۳ء کے جریدے DAIL میں تبصرہ کرتے ہوئے ایڈمنڈ ولسن نے لکھا کہ "مسٹر ہیمنگوے کی نظمیں قطعی اہم نہیں ہیں۔ غایتاً نامر جذبات اور ذہنی پیچیدہ علائق۔ مسٹر ہیمنگوے کے بنجر نکات" جواباً ارنسٹ نے ایڈمنڈ ولسن کے تبصرے پر اس کو جو مختصر خط لکھا، اس میں اس نے "نہایت دہشت زدگی اور احترام کے ساتھ خوشی" کا اظہار کیا۔ یہاں اس کا لہجہ خاصا طنز آمیز تھا۔ شیروڈ سے مماثلت کے حوالے سے ارنسٹ نے اس امر کی تردید کی اور اپنے افسانے کو ایک الگ موضوع قرار دیا۔

ایک اور نقاد MARGORET REID نے اس کی کہانیوں کو "ایک خاص قسم کا

کے جذباتی امکانات کی زود رنج محسوسات" قرار دیتے ہوئے ان کہانیوں کے موضوع کو وقت کے رواں دھارے جب زندگی کو محدود واضح اور مخصوص کر دیتے ہیں تو کہانی آن واحد میں دنیا کی ہر بے کار شے کو ملیامیٹ کر دیتی ہے" یہاں کہانیوں کی کامیابیوں یا ناکامیوں کی بات نہیں بلکہ نقطۂ نظر کا اختلاف واضح ہے۔ ارنسٹ نے جس طرح زندگی کو دیکھا تھا، وہ اکثر نقادوں کی نظر سے اوجھل تھا اور نقاد اس کے نکتہ نظر کے گوہر کو شناخت کرنے میں ناکام رہے تھے۔ جس کا ثبوت بعدازاں اس پر کی جانے والی تنقید سے واضح ہے۔

اپریل ۱۹۲۴ء میں TRANS-ATLANTIC نے ایک خصوصی شمارہ شائع کیا، جس میں ارنسٹ کی پہلی کتاب "تھری شارٹ سٹوریز اینڈ ٹن پوئمز" پر تبصرہ بھی تھا اور اس کی وہ معرکۃ الآرا کہانی بھی شامل تھی، جس سے اصلاً ارنسٹ کا ادبی ذہنی سفر آغاز پاتا ہے۔ یہ کہانی "انڈین کیمپ" INDIAN CAMP تھی، جس میں ارنسٹ اپنے ہیرو کی ذہنی تربیت یا اس کے ذہنی کشیدگی، پیچیدگی اور نفسیاتی دروبست کا مطالعہ کرتا نظر آتا ہے۔

انڈین کیمپ ایک متشدد واقعہ کا ایسا ہولناک منظر نامہ ہے، جس میں کہانی کار جدید عہد کی نہایت ترقی یافتہ سائنسی ایجادات پر شدید طنز کرتا نظر آتا ہے۔ کہانی کا ہیرو نک اپنے باپ ڈاکٹر ہنری نک کے ساتھ مشی گن کے شمالی علاقوں میں واقع ایک انڈین کیمپ میں جاتے ہیں، جہاں ایک عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہنری نک ۹ انچ لمبے پھل والے شکاری چاقو سے عورت کا پیٹ چاک کرتا ہے، تین عورتیں اور ایک مرد عورت کو پکڑے ہوتے ہیں مگر عورت کی چیخیں سارے ماحول کو دہشت زدہ کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ہنری کے قریب نوعمر نک چلمچی تھامے کھڑا ہے ۔ اس کمرے میں دیوار پر

بندھے تختہ پر چیختی کرلاتی عورت کا خاوند بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کو دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر کوشش کے بعد بچے کو ماں کے پیٹ سے نکال کر جب معذور باپ کی طرف دیکھتا ہے، تو معذور شخص بیوی کے اذیت ناک لمحات کو برداشت نہ کرتے ہوئے ایک تیز دھار استرے سے اپنی گردن کاٹ کر خودکشی کر چکا ہوتا ہے۔

ارنسٹ کو کبھی بھی انڈین سے دلچسپی نہیں رہی، مگر اپنے بچپن میں اس نے انڈین لوگوں کی بدحالی کو بنظر غائر دیکھا تھا۔ اس کہانی کا لوکیل بیر لیک ہے اور کیمپ بیکن فارم سے منسلک انڈین کی آبادی جہاں کبھی وہ ایک دو بار اپنے باپ ڈاکٹر ہمینگوے کے ساتھ جا چکا ہے۔

اصلاً یہ کہانی نک ایڈمز کی ہے، جو اندھیروں سے ڈرتا ہے اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی ردا میں پروان چڑھتا ہے۔ اس کہانی میں ارنسٹ یوں تو ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کرتا نظر آتا ہے، جو تخلیق کے لمحوں میں نہایت بے رحمی کا شکار ہے۔ مگر اس کی نظر اس بچے پر ہے جس کے ذہن پر ماحول کی چھاپ اس کے آنے والے دور کے لئے مرتب ہو رہی ہے۔ یہی بچہ نک ایڈمز مختلف روّیوں اور رنگوں میں ارنسٹ کی کہانیوں میں بار بار سامنے آتا ہے، جس کے ذہن پر متعدد زاویے ایک انصاف اور امن کی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹورنٹو سے واپسی پر، جہاں وہ اپنے جریدے کے سلسلے میں گیا تھا، اس نے اپنی زندگی کی طویل ترین کہانی "بگ ٹو ہرٹڈ ریور" BIG TWO HEARTED RIVER تحریر کی۔ یہ کہانی اس معصوم بچے کے بارے میں ہے جو پہلی بار انڈین کیمپ میں سامنے آیا تھا اور اب ایک جوان ہے اور تنہا مشی گن کے شمالی ساحل پر فوکس نامی دریا پر مچھلی کے شکار پر جاتا ہے۔ وہ میدان جنگ سے زخمی حالت میں واپس آیا ہے یہاں اس نے ایک بار پھر نظریہ ترک سے کام لیا۔ وہ ۱۹۱۶ء میں جب زخمی ہو کر آیا، تو مچھلی کے

شکار کے لئے دریا سے فوکس پڑ گیا تھا۔ اب اس نے اس دریا کو TWO HEARTED RIVER
کا نام دیا۔

۱۹۲۴ء میں جب ایذرا پاؤنڈ ارنسٹ کو اپنی گرد منگ ہوٹوڈ مستقل دے کر خود
دوسری جگہ چلا گیا۔ اس وقت تک ارنسٹ اور ایذرا ایک دوسرے کے بہت قریب
آچکے تھے، مگر ٹی ایس ایلیٹ کے بارے میں جو ارنسٹ کو میجر کے نام سے پکار کر چڑایا
کرتا تھا، ارنسٹ کی رائے بہت خراب تھی۔ جوزف کونریڈ کی وفات پر اس نے ٹی ایس ایلیٹ
کے بارے میں بہت سخت ریمارکس دیئے کہ "اگر وہ جوزف کونریڈ کو واپس لا سکتا تو ٹی ایس
ایلیٹ کو گرائنڈر میں پیس کر اس کا سفوف کونریڈ پر چھڑک کر اسے زندہ کر دینے سے گریز نہ کرتا"
ارنسٹ نے اپنی مختلف کہانیوں کا ایک انتخاب ترتیب دیا اور اشاعت کے لئے
بیسل کمب نیو یارک کو بھجوا دیا۔ جنوری ۱۹۲۵ء کے اواخر میں اس کے ساتھیوں نے اطلاع
دی کہ ناشر نے کتاب IN OUR TIME شائع کرنے کی حامی بھر لی ہے۔ مگر کچھ باتوں پر
وضاحت ضروری ہے۔ پہلے تو اسے اس پر یقین نہ آیا، مگر جب ناشر لائیو رائٹ کی طرف سے
جواب ملا، تو وہ اس پر خوش ہوا۔ اس پر پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ مسٹر رینڈ مسز ایلیٹ کے
بارے میں بعض پیرے فحش ہیں جو تبدیل ہونا چاہئیں۔ اسی طرح کہانی "اپ ان مشی گن"
فحش کی ذیل میں آتی تھی۔ اس نے ایک نئی کہانی "دی بیٹلز" UP IN MICHIGAN
"اپ ان مشی گن" کی جگہ شامل کرنے کے لئے بھجوا دی۔ اسی دوران THE BATTLER
۲۷ مارچ کو DIAL کی طرف سے اس کا افسانہ "ان ڈیفیٹڈ" UN DEFEATED اس
تبصرے کے ساتھ واپس آ گیا، کہ یہ بہت عظیم کہانی ہے مگر امریکی قارئین کے لئے "بہت
سخت"۔ اس کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ ڈائل کی اس زیادتی کو ساری زندگی نہیں بھولا۔ اس
نے دو طویل کہانیاں ارنسٹ والش کو امریکہ بھجوائیں، اور کہا کہ یہ کسی بھی معروف یا غیر معروف

میں چھپوا دے۔ والش کی طرف سے جلد ہی جواب آیا اور ساتھ ہی افسانے کی رقم کا چیک بھی، جو مور ہیڈ نے بھیجا تھا۔ مارچ کے اواخر میں IN OUR TIME افسانوں کے مجموعے کا معاہدہ BOONI AND LIVERIGHT ناشرین کے ساتھ ہو گیا۔ " ان اوور ٹائم "
کے بارے میں فلپ ینگ کہتا ہے۔ " بہت ممکن ہے مصنف نے اس عنوان (کتاب کے نام) میں کلیسائے انگلستان کی معمولا دعاؤں کی کتاب کے اس جملے کی طرف تمسخر آمیز اشارہ کیا ہو " ہمارے زمانے میں امن و امان رکھ اسے خدا! " بہرحال اس مجموعے میں سب سے چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ افسانوں میں امن و امان نام کو بھی نہیں ہے " یہ مجموعہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ اسی دوران اس کی ملاقات فزجیرالڈ FITZ GIRALD سے ہوئی جو مکمل پرنس نیویارک میں جو نیئر ایڈیٹر تھا اور ارنسٹ کو ایک ذہین افسانہ نگار سمجھتا تھا۔

اس کی مسلسل مصروفیات کے سبب اس کے گھر میں ہیڈلے کو نظر انداز کرنے کے منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔ ہیڈلے کو یہ احساس ہونے لگا، کہ فن کے نام پر ارنسٹ اسے ایک بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کر رہا ہے۔ یہاں سے تضادات کی ایک خاموش لہر اٹھتی نظر آتی ہے۔ پہلے بچے کی پیدائش پر جب ارنسٹ ہسپتال میں تنہا چھوڑ کر نیویارک جا رہا تھا، ہیڈلے نے سخت احتجاج کیا تھا۔

جولائی ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنا پہلا ناول " دی سن آلسو رائزز " THE SUN ALSO RISES لکھنا شروع کیا، جو ستمبر ۲۵ء میں مکمل ہو گیا مگر اس پر نظر ثانی کا کام مارچ ۱۹۲۶ء سے قبل مکمل نہ ہو سکا۔

اب ارنسٹ کی آوارہ خرامی، ہیڈلے کی زبوں حالی کا شدت سے سبب بننے لگی۔ تنہائی بیمار بچے اور ارنسٹ کی گھر سے غیر حاضری نے گھر کے ماحول کو آلودہ کر دیا۔ ارنسٹ

نے ہیڈلے کو طلاق پہ آمادہ کرنا چاہا مگر اس نے مطلقہ زندگی کو قبول نہ کیا۔ ایک روز تنگ آکر اس نے کہا کہ اگر اس کا جذبۂ عشق مطلقہ زندگی میں ناآسودہ رہتا ہے، تو وہ اس کے لئے خودکشی کرنے پر تیار ہے۔

"گو وہ سینٹ نہیں ہے: اور ابھی دنیا میں اس کے کرنے کو بہت کام پڑا ہے لیکن مرنے کے بعد جہنم میں جانے پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر ہیڈلے نے جواب دیا کہ اس نے ارنسٹ کو کبھی گناہ گار نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ تو اس کی توجہ گھر کی بدحالی کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے۔ حالات بہتر بنانے کی متمنی ہے، مگر اس ساری تلخی کا نتیجہ علیحدگی کی صورت برآمد ہوا۔

دوسری طرف اکتوبر ۱۹۲۶ء میں اس کا ناول" دی سن آل سو رائزز" سکرائبنرز SCRIBNER نیویارک کی طرف سے شائع ہوا اور دو ماہ کے اندر اس کی ۷۰۰۰ کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ ادارے نے پہلے ۵۰۰۰ نقاد شائع کی، پھر ۳۰۰۰ ہزار، بعدازاں ۲۰۰۰ کاپیاں۔ نقادوں کی طرف سے اس کے پہلے ناول کو سراہا گیا، کچھ منفی تنقید بھی ہوئی، مگر عمومی طور پر اس کے ناول کو پسند کیا گیا، البتہ اس کے باپ نے اسے ایک ادبی ڈائجسٹ "بک ریویو میگزین" BOOK REVIEW MAGAZINE کی کاپی بھیجی جس میں نہایت پریشان کن تبصرے شامل تھے" امریکی عوام کا جنسی ناول کے خلاف شدید ردِعمل" کے عنوان سے سخت اداریہ تحریر تھا۔ مگر ارنسٹ کی ماں خوش تھی کہ اس کے بیٹے کو ادب میں اہم مقام مل گیا ہے۔

ارنسٹ بڑا زود رنج تھا، دوسروں پر تنقید کرنا اور تمسخر اڑانا اس کے لئے عام رویہ تھا مگر خود پر تنقید کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ ایذرا پاؤنڈ جیسا شخص جس سے اس نے لاشعوری اثرات بھی لئے اور بعدازاں اسے بے حد احترام بھی دیا۔ پہلی ملاقات میں اس پر بھی تبصرہ کرنے سے باز نہیں رہا، اس کے اس رویے کے سبب ایک عجیب صورتِ حال اس کے گھر میں پیدا

ہوگئی تھی۔ مستزاد یہ کہ اب اس کے بیرونِ شہر سفر کرنے کا یہ عالم تھا کہ وہ مہینے کے زیادہ دن
اور کبھی مہینوں شہروں شہروں پھرتا رہتا۔ جس کا آخری نتیجہ ۱۱ر اکتوبر ۲۶ء کو اس کے اور
ہیڈلے کے درمیان علیحدگی کے لئے ۔۔ دن کا معاہدہ ہوگیا۔ جس کے بعد دونوں کے درمیان
طلاق ہوگئی۔ ہیڈلے اس کے بچے BOMBAY کو لے کر علیحدہ ہوگئی۔ اس نے ۱۶ر اپریل
۲۷ء کو ہیڈلے کو دیکھا، جو امریکہ جانے کی بجائے پیرس ہی میں رہ گئی تھی۔ چند ہفتوں کے
لئے ذہنی ناآسودگی کا شکار رہا مگر جلد ہی نئے طویل افسانے کی بنت میں مصروف ہوگیا اور جو آخر
معرکۃ الآرا کہانی تحریر کرنے میں کامیاب ہوا، جو اس کے ادبی کیریئر کے بہترین ادب کا حصہ ہے۔
مین وِدآؤٹ وومین MEN WITHOUT WOMEN اب اس کی حیثیت ادب کے معتبر اور
مین آف لیٹرز MAN OF LETTERS کی حیثیت تسلیم کی جانے لگی۔ پبلشر اس میں دلچسپی لیتے
تھے۔ کئی اداروں نے اس سے رجوع کیا۔ ایڈیٹر ڈون نہ نزیہ SCRIBNER'S EDITOR
نے اسے ایک کھلی پیشکش کی کہ اب وہ جو بھی ناول یا افسانوں کی کتاب لکھنا
چاہے ان کا ادارہ اس کے لئے ۳۰۰۰ ہزار ڈالر، ناول اور افسانے کی کتاب کے لئے ۱۰۰۰
ڈالر پیشگی اور ۱۵ فیصد رائلٹی پر معاہدہ کرنے پر آمادہ ہے۔ اسی دوران اس کی ایک
خاتون پالن PAULINE سے ملاقات ہوئی، جو بالآخر ۲۷ر اپریل ۱۹۲۷ء کو شادی
پر نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو اس کے افسانوں کا مجموعہ "مین وِدآؤٹ وومین" شائع ہوا۔
اس وقت تک اس کی پہلی کتاب سن آل سو رائزز کی ۲۳۰۰۰ کاپیاں فروخت ہوچکی
تھیں اور اس پر زیادہ مثبت اور کہیں کہیں منفی تبصرے بدستور شائع ہو رہے تھے۔
اسی دوران سال کے آخر میں پالن نے امریکہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تاکہ
اس کا پہلا بچہ وہیں پیدا ہو، مگر بعض مجبوریوں کے سبب ارنسٹ گریزاں تھا۔ خاص طور

پر ہیڈلے کی طلاق نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ کیونکہ ہیڈلے کے بارے میں جہاں اس کے دوستوں نے اس پر سخت تنقید کی تھی، ویسے ہی ردِ عمل وہ خود اپنے گھر میں بھی توقع کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ پالین کی اس خواہش کا احترام نہ کر سکا کہ اس کا پہلا بچہ امریکہ کی سرزمین پر پیدا ہو۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء میں اس کا ایک بار پھر ہیڈلے سے آمنا سامنا ہوا۔ اسے ہیڈلے زیادہ خوبصورت اور سمارٹ نظر آئی۔ ارنسٹ نے اس کی تعریف کرنی چاہی اور پچھتاوے کا اظہار کیا۔ مگر ہیڈلے نے بتایا کہ اب وہ کسی اور کے ساتھ پیار کرتی ہے۔ اس لئے اب اسے ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہیئے۔ ارنسٹ کو پہلی بار پالین ذرا کم تر لگی، کیونکہ اس کے بقول ہیڈلے کے مقابلے میں اسے ۳۲ سال کی عمر میں پہلا بچہ جنم دینے کے بعد پیچیدگیوں کا شکار ہونا پڑے گا۔ اس وقت ارنسٹ کی عمر ۲۸ سال تھی۔

اسی دور میں اسے ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جرمن جانا ہوا۔ جہاں اس کی ملاقات پہلے امریکی نوبیل پرائس ونر سنکلیر لیوز سے ہوئی۔

۱۹۲۷ء کا اواخر اس کے لئے کئی بیماریاں ایک ساتھ لایا، جنہوں نے پھر ساری عمر ساتھ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی کچھ ذہنی پریشانیاں بھی سامنے آئیں۔ اس کے گلے میں درد شروع ہوا، جو بالآخر شدت اختیار کر گیا۔ اس دوران وہ اپنے بیٹے بمبے سے ملنے گیا، اس کے ساتھ کھیلنے کے دوران بچے کی انگلی اس کی بائیں آنکھ میں گھس گئی، جو پہلے ہی بینائی میں کمی کا شکار تھی۔ آنکھ کی پتلی میں چوٹ آئی، جو بالآخر بینائی سے مزید محرومی کا سبب ٹھہری۔ ان ہی دنوں اوک پارک نیوز کا ایک شمارہ اسے ملا جس میں ایک شہ سرخی اس کی ماں کے بارے میں تھی، جس نے ۵۲ سال کی عمر میں مصوری سے اپنے کیرئیر کا آغاز کیا تھا، اس کا انٹرویو بھی شامل تھا، جس میں اس نے حقیقت پسندی اور نئی نسل کا مذاق اڑایا تھا۔ ارنسٹ اس وقت امریکی ادبی منظرنامے پر ایک انتہا پسند حقیقت نگار مشہور تھا

چنانچہ جب اس کی ماں کا جواب اس کے سامنے آیا، تو کچھ دیر کے لئے پریشان ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں

"نئی نسل کی امید پرستی" اس کی ماں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اب پنڈولم واپس آرہا ہے اپنے معمول کی طرف ۔ خدا آسمان پہ اور مخلوق زمین پر ۔"

تین ماہ کی اس مدت میں اس کے مجموعے "مین ود آؤٹ ویمن" کی پندرہ ہزار کاپیاں فروخت ہو کر ہر حلقے سے اس کے لئے داد طلب کر رہی تھیں۔ جون ۱۹۲۸ء تک یہ تعداد ۱۹۰۰۰ ہوگئیں۔

مارچ ۲۸ء میں ایک رات کسی دعوت سے گھر لوٹا۔ باتھ روم جاتے ہوئے اچانک ہاتھ لگنے سے سکائی لائٹ کا شیشہ ٹوٹا اور اس کا ایک ٹکڑا اس کے ماتھے میں داخل ہو گیا۔ جس سے تقریباً ۲ انچ گہرا زخم آیا۔ جبکہ آنکھ اور چہرے پر کئی زخم آئے۔

جون کے آخری ہفتے میں (۲۷ جون ۲۸ء) کو پالن کے بطن سے اس کا پہلا بیٹا پیٹرک پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی میں شہرت کی انتہاؤں کی طرف رواں ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا شاہکار وداع جنگ تحریر کرنا شروع کیا۔ جنوری ۲۹ء میں اس نے آغاز کر کے ۷ ہفتوں میں اسے مکمل کر لیا اور ساتھ ہی اسے قسط وار شائع کرنے کے لئے سکرائبنرز (امریکہ) سے معاہدہ ہو گیا۔ جس کا معاوضہ ۱۶ ہزار ڈالر ملا اور جب اکتوبر کے اوائل میں یہ ناول شائع ہوا، تو اکتوبر کے آواخر تک اس کی اٹھائیس ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ نومبر تک پہنچتے پہنچتے یہ امریکہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ناول بن چکا تھا۔ امریکہ، فرانس، برطانیہ اور دیگر کئی ممالک میں اس پر شاندار تبصرے آنے لگے۔ اب اس کے سامنے شہرت اور دولت آن کھڑی ہوئی تھی مگر اس کے مسلسل سفر نے اسے کبھی بہت زیادہ آسودہ نہ رہنے دیا۔ اسی دوران آنکھ اور پیشانی کی تکلیف کے ساتھ گردے کا

درد بھی ہونے لگا۔ نومبر ۳۰ء میں پالن کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش ہوئی اور ۱۹۳۱ء میں انہوں نے کنساس میں قیام کیا۔

اس عرصہ میں اس کی کہانیاں سکرائبنز اور کئی دیگر جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور اس کے سفر کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے کیوبا اور بعد ازاں افریقہ کا دورہ کیا۔ اسی سال اس کی کتاب ڈیتھ ان افٹرنون DEATH IN AFTERNOON شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں خوبصورت تبصرے ہوئے، بعض اخبارات نے اسے رومانیت قرار دیا۔ جس میں فلسفۂ موت سما نہیں سکا۔'

ان ہی سالوں میں اس کی شہرت اور کامیابی کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا، جب اس کے ناول پر پکچر نے فلم بنانے کا فیصلہ کیا اور ناول کے نام " وداعِ جنگ " اے فیرول ٹو آرم کے ٹائیٹل سے ہی فلم تکمیل پا کر بازار میں آ گئی۔ فلم کا شاندار استقبال ہوا۔ جس میں گیری کوپر، ہیلن ہائزے اور رایڈولف جیسے بڑے اداکاروں نے کام کیا تھا اور جو اپنے وقت کے بہترین اداکار تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ فلم امریکہ اور یورپ میں ہی نہیں پوری دنیا میں کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔

اب وہ پبلسٹی اور شہرت سے خود کو بچانے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہرت اور پبلسٹی تخلیقی کاموں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ جنوری ۳۲ء میں FESTCHRIFT ادبی جریدے کی طرف سے ایذرا پاؤنڈ پر خصوصی نمبر کے لئے مضامین اور آرا کی اپیل کی گئی۔ ارنسٹ نے لکھا۔

" کوئی بھی شاعر جو اس صدی میں یا گزشتہ صدی کے آخری دس سالوں میں پیدا ہوا جو ایمانداری سے یہ کہہ سکے کہ اس نے ایذرا کی شاعری اور دیگر تخلیقات سے کسب فیض نہیں کیا (اگر کوئی ایسا کہے تو) وہ جھٹلائے جانے کی بجائے ترس کا حقدار ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے اس دور میں کوئی نثرنگار ہو اور یہ دعویٰ کرے کہ اس

نے جیمس جائس کے فن سے کچھ نہیں سیکھا..... ایذرا کے فن میں اعلیٰ ترین تخلیقی کنٹوٹ ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، جب تک ادب زندہ ہے"۔

۱۹۳۲ء میں نیو یارک میں پارکنز نے دوپہر کے کھانے پر اسے تھامس دولف سے ملایا جو اس کے عہد کے ناول میں ایک اور بڑا نام تھا، اسی دور میں اس کی انتہا پسندانہ جبلت ایک بار پھر اُبھر آئی۔ اس نے اس دوران تین کہانیاں تخلیق کیں اور وہ غیر تخلیقی کاروں کے خلاف پہلے سے زیادہ نکتہ چیں بن گیا۔ یہاں تک کہ اپنے بہترین دوست سکاٹ فزجیرالڈ اور اس کی بیوی زیلڈا کو بھی معاف نہیں کیا، جو شراب نوشی کے سبب لکھنا بند کر چکا تھا۔ البتہ زیلڈا نے ایک مختصر ناول تحریر کیا تھا جس کے بارے میں ارنسٹ کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا، مگر فز جیرالڈ کو وہ واپس تخلیق میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دو ہی واقعات اسے واپس لا سکتے ہیں۔ یا تو اس کی بیوی زیلڈا کو ہر صورت مرجانا چاہیے، یا اس کا معدہ اس قدر خراب ہو جائے کہ مزید شراب نوشی کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

وہ جون ۳۳ء میں JOE RUSSELS کے جریدے ANITA کی طرف سے رپورٹنگ کے لئے دوبارہ کیوبا گیا۔ جہاں اس نے اپنی کہانیوں کے نئے مجموعے WINNER TAKE NOTHING مکمل کیا۔ مگر یہ پہلوں کی نسبت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ اس کا پس منظر سترھویں صدی کی اخلاقیات سے متعلق تھا۔ اور اس ارنسٹ نے انسان کی نیکی سے منکریت کو بنی نوع انسان کے حالات کے پس منظر میں قابل قبول بنایا تھا۔ جون میں ہی اس کی کہانی "ڈیتھ ان آفٹر نون" کے بارے میں ایک جریدے نیو ری پبلک NEW REPUBLIC میں ارنسٹ کے ایک پرانے دوست بل ایسٹ مین کی طرف سے تبصرہ شائع ہوا۔ ایسٹ مین نے قدرے منفی انداز میں زیر عنوان "بل ان آفٹر نون" BULL IN AFT ER NOON افسانے کو اخلاقیات سے "عاری سانڈ" قرار دیتے ہوئے اسے ایک ایسی تخلیق کہا جس پہ ارنسٹ

نے ہسپانوی بُل فائٹنگ کا پلاسٹر چڑھا کر پیش کیا، کیونکہ وہ (ارنسٹ) اب بھی سپین میں داخل ہوا اپنی وحشیانہ صداقت کو شباب کی رومانیت میں لپیٹ کر سامنے لایا۔ ایسٹ مین نے اس کے جنسی رویوں کو بے راہروی سے تعبیر کیا۔ اس کے خیال میں ہمینگوے میں غیر متزلزل اعتماد کی کمی تھی۔

گو ادبی طور پر اس تبصرے کا زیادہ نوٹس نہیں لیا گیا لیکن ارنسٹ کے ایک دوست آرشی میکلیش ARCHIE MACLAISH نے ایڈیٹر کے نام خط اور مضمون میں ایسٹ مین کے خلاف شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ جریدے کے ایڈیٹر بروس بلیون BRUCE BLIVEN نے معذرت کی اور آئندہ ایسے تبصروں سے گریز کا وعدہ کیا۔ مگر ارنسٹ نے ایک چبھتا ہوا طنزیہ کھلا خط ایڈیٹر کے نام لکھا جس میں ایسٹ مین کو بُری طرح رگیدا۔ کتاب کے ناشر پارکنسن نے ارنسٹ کو خط لکھا کہ اگر ایسٹ مین نے اس مضمون کو اپنی کتاب میں شامل کیا تو وہ اپنے کونسل کے ذریعے اسے جیل بھجوا دے گا۔

۱۹۳۴ء میں ارنسٹ کے افسانے اور مضامین اسکوائر ESQUIRE میں تواتر سے شائع ہوتے رہے جن میں NOTES ON DANGEROUS GAME اور دیگر کئی افسانے معروف ہوئے۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں وہ افریقہ کے سفر پر روانہ ہوا اور کئی ملکوں شہروں اور جنگلوں کی سیر کی جن میں ممباسا، نیروبی، ٹانگانیکا، جبوتی، موگا دلیشو وغیرہ شامل ہیں۔ واپسی پر اس سفر کے حوالے سے اس نے نئی کتاب GREEN HILL OF AFRICA لکھی جو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس سال اس کی کئی مزید کہانیاں مختلف جرائد میں طبع ہوئیں۔ ۳۴ء کے آواخر میں اس کی ملاقات ممتاز دانشور اور ادیب جیمس جائس سے ہوئی اور اگلے سال اپریل ۳۵ء میں امریکی کہانی کار کھترین این پورٹر سے ملا۔ دونوں شخصیات کے

بارے میں اس کے خیالات نہایت اعلیٰ تھے۔

۱۹۳۷ء اس کے لئے ایک اور کامیابی لے کر آیا جب اس کی کتاب TO HAVE AND HAVE NOT شائع ہوئی، اکتوبر ۱۵، (تاریخ اشاعت) سے نومبر کے اوائل تک پندرہ بیس دنوں میں یہ کتاب امریکہ کے نیشنل بک کلب کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں چوتھے نمبر پہ آگئی اور دو تین ماہ میں اس کے ۲۵ ہزار سے زائد نسخے فروخت ہوئے۔ مگر اس کے بارے میں تبصرہ نگاروں کے تبصرے ملے جلے تھے۔ ٹائمز ڈیلی نیویارک نے اسے کور سٹوری COVER STORY کے طور پر شائع کیا اور ارنسٹ کو ایک ایسا فنکار قرار دیا، جسے زندگی کے تجربات نے ایک بہترین اسلوب پیش کش کا اعلیٰ طریق کار اور بالغ نظر اندازِ فکر عطا کرنے میں مدد دی ٹائمز کے مطابق جس طرح دائیں اور بائیں کی شدید سیاسی آویزش نے فضا کو گھیر رکھا ہے، ارنسٹ نے اس سے بچتے ہوئے ایک نئے زاویہ نظر کو پیش کرنے میں کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ ایک دوسرے تبصرے میں LOVIS KNENBLERDER کتاب کو الجھی ہوئی اور عبوری تحریر قرار دیا۔ جس کی پائیداری اور قبولیتِ عام مشکوک ہو۔

ارنسٹ نے اس کتاب کے پس منظر کو سپین کی خانہ جنگی سے اخذ کیا تھا۔ اس چیز نے ٹائمز کو مجبور کیا کہ وہ سماجی شعور کی بہترین تخلیق قرار دے۔ برطانیہ میں اس کا ردِ عمل امریکہ کی نسبت قدرے دھیما اور معاصرانہ تعصب پر مبنی تھا۔ جہاں کچھ لوگوں نے اس کے فن پر تنقید کی اور اس کی زبان و بیان اور مصنوعی استغراق پر اعتراضات کئے، وہیں تنقید نگاروں میں ایک بڑی تعداد ایسے ادیبوں پر مشتمل تھی جنہوں نے اس کے افسانوں میں استعمال اصطلاحات، لفظیات، کہانی کی بنت اور موضوع کی ارفعیت کی تعریف کی اور اسے عصرِ حاضر کا بڑا افسانہ نگار قرار دیا۔

۱۹۳۸ء میں اس کے افسانوں کے علاوہ ادبی موضوعات پر تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے۔ مضامین میں دی ہیٹ اینڈ دی کولڈ THE HEAT AND THE COLD اور ۱۹۴۰ء میں اس کی تخلیقات THE GREAT CRUSADE اور FOR WHOM THE BEST SELLER شائع ہوئیں۔

۱۹۳۷ء میں ایک اور واقعہ ہوا، جس میں ارنسٹ نے شرکت کی۔ جب جنرل والٹر نے مئی میں سگر دیا پر حملہ کر دیا اور اسے ناکام بنا دیا گیا مگر وفادار فوجی اس حملے کو نہ روک سکے، جو باغیوں کی طرف سے شمالی صوبہ پر قبضہ کی صورت میں سامنے آیا۔ اس جنگ میں ارنسٹ ایک امریکی جریدے کی طرف سے محاذِ جنگ پر تھا، جو اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ نہایت لگلے مورچوں تک گیا، جہاں اس نے دو سال گزارے اور یہیں اس پر جنگ میں ملوث ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔

اسی دوران پالین اور اس کے درمیان دوری کے فاصلے بڑھنے لگے۔ اس کا بار بار سفر اور مختلف خواتین سے رابطہ پالین کو ایک مسلسل پریشانی میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ دونوں کے درمیان کشیدگی کے بعد علیٰحدگی کے مقام تک لے آیا ۔ پالین اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان تضادات اور کشیدگی کے باوجود پالین ہمیشہ اس کے لئے کلمۂ خیر کہتی، مگر اب ارنسٹ کی نظریں دوسرے آفاق پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس ساری صورتِ حال کا منطقی نتیجہ ۴ر نومبر ۴۰ء کو برآمد ہوا اور ارنسٹ نے پالین کو طلاق دے دی۔ ۱۳ سالہ ازدواجی زندگی میں اس کی سات کتابیں شائع ہوئیں، بے شمار دولت کمائی، مگر زیادہ تر سفر پہ خرچ کیا جو بھی صورت رہی، بالآخر اس نے اپنی دوسری بیوی سے پیچھا چھڑایا اور ۲۰ر نومبر ۴۰ء کو مارتھا گلھارن سے شادی کر کے نیویارک میں ہنی مون منانے روانہ ہو گیا۔

۱۹۴۰ء کے اوائل تک اس کے ناول " فار ہوم دی بل ٹولز " کی ایک لاکھ نوے ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں اور یہ ناول مہینوں نیشنل بک کلب کی BEST SELLER پر سر فہرست رہا ۔ ۱۹۴۲ء میں یہ ناول دوبارہ محدود اشاعت کے ساتھ نیشنل بک کلب نے شائع کیا۔ جس پر اس وقت کے نوبیل انعام یافتہ ادیب سنکلیر لیوز نے دیباچہ تحریر کیا۔

۱۹۴۴ء میں جہاں اس کے کئی افسانے شائع ہوئے وہیں اس کی نظموں کا مجموعہ TO MARRY IN LONDON بھی طبع ہوئی۔

۱۹۴۱ء میں ایک بڑے نقاد ایڈمنڈ ولسن نے ارنسٹ کے فن پر تفصیلی جائزہ WOUND AND THE BOW کے عنوان سے کیا جس میں اس کے فن کو آغاز کو شاندار قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کا شاندار آغاز اس کے کرافٹ شپ کی ناکامی کی صورت سامنے آ رہا ہے، ارنسٹ جو ایڈمنڈ ولسن کو ایک معتبر شخصیت سمجھتا تھا اسے یہ تبصرہ پسند نہیں آیا۔

۴۲ء کا آغاز اس کے لئے زیادہ مفید نہیں رہا۔ انکم ٹیکس کے محکمے نے ارنسٹ کی گزشتہ سال کی آمدنی ۱۳۷۳۵۷ ڈالر بنائی، جس کے مطابق ۸۵ ہزار ڈالر انکم ٹیکس ادا کرنا تھا۔ اس نے سکرائبنرز سے ۱۵ ہزار ڈالر کے ایڈوانس کی بات کی جسے انہوں نے ٹال دیا۔ ارنسٹ سخت غضب ناک تھا۔ اس نے کہا کہ ایک ادیب اپنی ساری زندگی کی محنت سے جو چند روپے کماتا ہے وہ حکومتوں کی نااہلی اور جنگجویانہ روّیے کے سبب چھین لئے جاتے ہیں۔ اب ارنسٹ کے سامنے ایک نیا چیلنج تھا، ان ہی دنوں اتفاق سے ہالی وڈ کے بعض فلم ڈائریکٹروں نے اس کے ناول ۔ فار ہوم دی بل ٹولز، کو فلمانے کے لئے اسے پیشکش کر دی اور اسی طرح اس کے کچھ مسائل کم ہونے لگے۔

۱۹۴۲ء میں دوسری جنگِ عظیم نے زور پکڑ لیا، اب امریکی حکومت نے ادیبوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ جنگ کے لئے لکھیں۔ کئی بڑے بڑے ادیبوں نے جن میں جان سٹین بک بھی شامل تھا اس نے BOMBS AWAY جیسی کتاب ایئر فورس کے لئے لکھی تھی مگر ارنسٹ ہیمنگوے نے جواب دیا کہ جنگ پر لکھنے کی بجائے اگر اسے اپنی تین انگلیاں کاٹنی پڑیں، تو وہ قبول کر لے گا۔ وہ خود جنگ پر جانے پر آمادہ تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنے بچے کو محاذ پر بھیجنے کی پیشکش کی (جو ابھی بہت چھوٹا تھا) مگر جنگ پر لکھنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس کا خیال تھا سرکار کے لئے لکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک واقعات میں حقیقتِ کلی نہ ہو جبکہ حقیقتِ کلی کا ادراک جنگ کے دنوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ ان ہی دنوں میکسیکو سے واپسی پر اس نے مارتھا کے ساتھ مل کر ہوانا میں دانشوروں کی ایک ایسی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا جو ففتھ کالمسٹ تحریک کے اثر و رسوخ کو زائل کر سکے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ خود جنگ میں شریک تھا۔ اور اس نے پہلے توپخانہ ڈویژن میں بطور ڈرائیور کام کیا۔

۱۹۴۴ء میں اس کے اور مارتھا گلہارن کے درمیان اختلافات اور دوری کی دیوار بلند ہونے لگی، نومبر ۴۴ء میں معاملہ طلاق تک آن پہنچا اور اس نے طلاق کے بعد مینی سوٹا کی رہنے والی میری والش سے شادی کر لی۔ جو اس کی آخری بیوی ثابت ہوئی۔

۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۰ء اس نے بیشتر کہانیاں لکھیں، جن میں سے ACROSS THE RIVER AND INTO THE TREES ۱۹۴۴ء میں شائع ہو کر مقبول ہوئی اور اسی نام سے ۱۹۵۰ء میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں اس کا مشہور افسانہ THE SHOT جریدے TRUE میں طبع ہوا، جس پر اسے کافی داد ملی، ۱۹۵۲ء میں اس کا ناول (جسے طویل ترین افسانہ بھی کہا گیا ہے) "بوڑھا اور سمندر"

THE OLD MAN AND THE SEE جریدے لائف میں شائع ہوا۔

اب ارنسٹ ادب و فن کی ان منزلوں پر تھا، جہاں وہ اپنے عصر کے بڑے بڑے ادیبوں کو چیلنج کر سکتا تھا۔ اب اس کی شہرت جہاں اس کے افسانوں اور ناولوں کے لئے عام تھی، وہیں اس کے جہاں گردی میں کوئی ادیب اس کا ثانی نہ تھا، ۲۱، جولائی ۱۹۵۴ء کو جب وہ ٹھیک پچپن سال کا تھا، اسے جہاں سالگرہ کی مبارک کے طور پر INTERNATIONAL YACNT CLUB کی جانب سے آرڈر آف کاریوس کا ایوارڈ ملا۔ وہیں یہ افواہیں بھی اس تک پہنچیں کہ اس کا نام نوبیل انعام پانے والوں کی فہرست میں شامل ہے، اس نے یہ خبر سنی اور دل رنجیدہ ہو کر کہا کہ اگر نوبیل انعام کی رقم ٹیکس سے مستثنا ہوئی تو وہ جہاز سمنا ۱۸۰ خریدے گا اور اس پر دنیا کی سیر کرے گا اور اگر انعام کی رقم پر ٹیکس لگا تو یہ اس کے لئے خطرناک ہوگا۔

بالآخر ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یہ افواہ حقیقت میں بدل گئی اور ارنسٹ ہمینگوے کو دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ "جدید ادب کی تاریخ کا ایک طاقتور اسلوب ساز ادیب ارنسٹ ہمینگوے"

ارنسٹ ہمینگوے کو سویڈش نوبیل انعام کیٹی نے انعام کا مستحق قرار دیتے ہوئے اسے خراج تحسین پیش کیا مگر ساتھ ہی اسے اس کی ابتدائی تحریروں پر بہت نیکی اور اخلاقیات کا منکر اور بے رحم بھی کہا اور اسے "غیر معمولی رجحانات اور عظیم ادبی تخلیقات" پر انعام کے لئے نہایت موزوں سمجھا، خاص طور پر اس کے نظریۂ فن جس میں وہ "ہر اس شخص کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے جو جہانِ صداقت پر قابض تشدد اور موت کے خلاف نبرد آزما ہو۔" ارنسٹ کو سونے کے تمغے کے ساتھ ۳۵ ہزار ڈالر کا نقد انعام ملا۔ رقم اس نے اپنے قرض خواہوں کو لوٹا دی اور سونے کا تمغہ کیوبا کے سینٹ

کی نذر کر دیا تا کہ اسے مقدس مریم پر آویزاں کر کے محفوظ کر VIRGEN OF COBRE
لیا جائے۔

ارنسٹ کا نظریہ فن موت کا تعاقب ہے۔ اس نے ادب اور زندگی کے ہر دو میدانوں میں ایسے موضوعات اور عمل کا انتخاب کیا، جہاں قدم قدم پر موت اسے راستے میں کھڑی ملتی ہے، شاید ادب کی دنیا کا واحد لکھاری ہے، جس نے اپنی زندگی کے ۶۱ سال موت کا پیچھا کیا اور بڑی بہادری اور جانبازی سے موت کو ہر ہر قدم پر شکست دی۔ سانپوں کے شکاروں کی طرح وہ ساری عمر موت سے جنگ کرتا رہا، مگر ہر قدم پر موت کو گلے لگانے کے تصوّر سے بے نیاز بھی نہ تھا۔ تشدد اس کی زندگی اور ادب دونوں پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تشدد انسان کی اہلیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ جو نشان تشدد سے پڑتا ہے، وہ روح پر ہو یا جسم پر اس کے نشان انمٹ ہوتے ہیں۔ مگر ارنسٹ کی تو جنگ اور تشدد کی ہے۔ جہاں دو عظیم جنگوں کے علاوہ سینکڑوں متشدد تصادموں میں لاکھوں انسانوں کی بے توقیر موت اس صدی کا مقدر ہے۔ معصوم بچّے تک سے جہاں ارنسٹ بڑی بے رحمی کے ساتھ ایک عورت کے پیٹ کو چیر کر بچّے کی تولید ہوتے دیکھتا ہے (افسانہ انڈین کیمپ) سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک تشدد کے یہ نشان اس کی روح اور جسم پر بدستور نظر آتے ہیں۔ محاذِ جنگ، خانہ جنگی، موت سے ٹکرانے والے شکار، مشکل ترین سفر سارے مناظر ایک بڑے متشدد منظر نامے میں بدلتے اور اس موت کے تعاقب پر مجبور کرتے ہیں۔ جنسی تلازمے اسی متشدد فضا سے نکلنے کی ایک موہوم سی کوشش نظر آتے ہیں، لیکن ہیڈلے سے طلاق کے وقت ابھرنے والا خودکشی کا تصور اس منظر نامے میں لہو رنگ تصویر ابھارنے کا آغاز بن جاتا ہے۔ اس کے دوست، عزیز، رشتہ دار، بیوی بچے سب اس کے تصورِ موت

سے لرزاں اور مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نک کے سامنے معذور لوگوں کا قتل
(THE KILLER) اور نک ایڈمز کا گھٹنے پر زخم (وداعِ جنگ) A FAREWELL
TO ARM خود ارنسٹ کے گھٹنے کی چوٹ کی معنوی اور علامتی تفسیر ہے۔ موت کا
ایک المناک منظر TO HAVE AND HAVE NOT کے ہنری مورگن کی موت
کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ "تنہا جنگ کا منطقی نتیجہ ایک عبرتناک شکست
کے سوا کیا ہے"۔ اس خیال کو تقویت اس کے کھیل ففتھ کالم FIFTH COLUMN کی
کہانی کے مجموعی تاثر سے ملتی ہے کہ" اکیلا آدمی اپنی جگہ پر مکمل جزیرہ نہیں ہے" اس کی
مزید توثیق FOR WHOM THE BILL TOLLS کی اس ماتمی گھنٹی کی آواز ہے
جو کسی ان جانے شخص کی موت پر بج رہی ہوتی ہے۔ اس ناول میں شاہ پرستوں کے لئے امریکی
رضاکار کی حیثیت سے خود جس جنگ کو لڑتا رہا تھا اور زخمی ہوا تھا، پیش کرنے میں اعلیٰ
کرادنت شپ کا مظاہرہ کرتا ہے، مگر زخمی حالت میں ساتھیوں کا اسے اکیلے چھوڑ جانا
موت کے تعاقب میں اس کی رفتار کو مہمیز لگنے کا سبب بنتا ہے۔ موت یہاں بھی
ایک طاقتور علامت کے طور پر اس کے چاروں طرف منڈلاتی ہے۔ ایک سوال اور پیدا
ہوتا ہے کہ بوڑھا اور سمندر OLD MAN AND THE SEA میں بوڑھے مچھیرے
کی فتح کو فتح کہا جا سکتا ہے؟ جہاں شارک اس کے شکار کو چھین کر اسے محض ہڈیوں کا
ڈھانچہ دے کر سمندر میں گم ہو جاتی ہیں۔ یہ منظر ارنسٹ کے اس علامتی رویے پر دال ہے
جہاں وہ سارے منظر کو گمبھیر علامتوں میں سمندر، بوڑھا، شارک، شکار، مچھلیاں اور کشتی کو
دنیا میں ہونے والے طاقتور اور متشدد کھیل میں دیکھتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں خود کو مکمل طور
پر موت کے منہ میں دینے کا اس سے زیادہ اور کون سا واقعہ ہے، جب وہ بمبار
طیاروں میں دشمن کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔

ساری صورتِ حال کی زیادہ بہتر انداز میں فلپ ینگ نے صراحت کی ہے: "ہمینگوے کی دنیا وہ جگہ ہے جہاں چیزیں بڑی اور بارآور نہیں ہونے پاتیں بلکہ ایک دھماکے سے پھٹ جاتی ہیں، ٹوٹ پھوٹ، گل سڑ جاتی ہیں یا انہیں گھن لگ جاتا ہے اور جو چیزیں اس دنیا کو مکمل بدبختی کا شکار ہونے سے بچاتی ہیں وہ ہیں برداشت، استقلال اور جرأت۔"[۳۱]

مگر تابہ کے ـــــــــــــ ایک دن موت کا تعاقب کرتے کرتے موت خود اس کی گرفت میں آگئی۔

۲ر جولائی ۱۹۶۱ء کو وہ حسبِ معمول علی الصبح جاگ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی میری والش سوئی ہوئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا تہہ خانے کے دروازے کے سامنے پہنچا، جس پر اس کی بیوی نے تالا لگا رکھا تھا، وہ اس طرح آہستہ آہستہ قدم جماتا، باورچی خانے تک آیا اور ایک دراز سے تہہ خانے کی چابیاں نکال کر دوبارہ تہہ خانے کی طرف لوٹا ـــ تالا کھولتے ہوئے نہ تو اس کے ہاتھ میں لرزش تھی، نہ چہرے پر کوئی غیر معمولی آثار ـــ وہ اندر داخل ہوا اس کے سامنے اس کا اسلحہ خانہ تھا، جہاں دونالی بندوق پڑی تھی، جس سے اس نے برسوں بڑے بڑے طاقتور جانوروں کو ڈھیر کر دیا تھا۔ اس نے بندوق اور چند کارتوس اٹھائے اور اسی طرح دروازے کو تالا لگا کر، چابی باورچی خانے میں رکھی اور کھلی جگہ آگیا، جہاں سے اس کے قدموں کی آواز دوسرے کمرے تک سنائی نہ دے ـــ اس نے دونالی بندوق میں دو کارتوس لوڈ کئے ـــ لبلبی درست کی اور اپنا سر دونالی کے اوپر ایسا ٹیک دیا جیسے برسوں کا بھولا ہوا شخص اپنے محبوب کے حضور سربسجود ہو۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ لبلبی تک پہنچا، انگوٹھے کے دباؤ سے لبلبی نیچے جانے لگی، اور معاً ایک ہولناک دھماکہ ہوا۔ ارنسٹ کا جسم جب زمین پر گرا تو موت اس کمرے میں اس شخص پر قابو

پا چکی تھی جس نے نصف صدی سے زیادہ اس پر گرفت قائم رکھی تھی — اور دور کرسٹ کی گھنٹیاں جرس کی آواز بن کر ایک نابغۂ روزگار افسانہ نگار کی رخصتی کے اعلان میں بدل چکی تھی ۔

حوالہ جات

۱۔ ارنسٹ ملر ہیمنگوے ERNESDT HEMINGWAY

۲۔ گریس ہال۔ بحوالہ "اے لائف سٹوری۔ ارنسٹ ہیمنگوے" از کارلوس بیکر۔ صفحہ ۹

۳۔ ایضاً

۴۔ الزبتھ ہیڈلے رچرڈسن ELIZBITH HADLEY RICHARDSON

۵۔ بحوالہ کارلوس بیکر

۶۔ ٹی ایس ایلیٹ۔ ممتاز دانشور، شاعر اور نقاد۔ برطانوی نوبیل پرائز ونر (۱۹۴۸ء)

۷۔ فلپ ینگ "ارنسٹ ہیمنگوے"، ترجمہ محمد سلیم الرحمن، مکتبہ میری لائبریری۔ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۵

۸۔ سنکلیر لیوس۔ پہلا امریکی نوبیل انعام حاصل کرنے والا۔ (۱۹۳۰ء) ممتاز ناول نگار۔

۹۔ وداعِ جنگ A FAREWELL TO ARM ناول کے علاوہ دنیا کی مقبول ترین فلم۔

۱۰۔ بل ایسٹ مین۔ تبصرہ نگار برائے نیو ری پبلک BILL EAST MAN

۱۱۔ ٹائمز نیویارک

۱۲۔ فلپ ینگ

Earnest Hemingway

Bibliography

Fiction

Three Stories and Ten Poems. 1923.
In Our Time (sketches). 1924.
In Our Time: Stories. 1925: revised edition, 1930.
The Torrents of Spring: A Romantic Novel in Honor of the Passing of a Great Race. 1926.
The Sun Also Rises. 1926; as Fiesta, 1927.
Men Without Women (stories). 1927.
A Farewell to Arms. 1929.
God Rest You Merry Gentlemen (stories). 1933.
Winner Take Nothing (stories). 1933.
To Have and Have Not. 1937.
The Fifth Column and the First Forty-Nine Stories (includes play). 1938.
For Whom the Bell Tolls. 1940.
The Portable Hemingway, edited by Malcolm Cowley. 1944.
The Essential Hemingway. 1947.
Across the River and into the Trees. 1950.
The Old Man and the Sea. 1952.
Hemingway in Michigan (stories), edited by Constance Cappel Montgomery. 1966.
The Fifth Column and Four Stories of the Spanish Civil War. 1969.
Islands in the Stream. 1970.
The Nick Adams Stories, edited by Philip Young. 1972.
A Divine Gesture: A Fable. 1974.
The Garden of Eden. 1986.

Plays

Today Is Friday. 1926.
The Spanish Earth (screenplay). 1938.
The Fifty Column (produced 1940). In The Fifth Column ... 1938.

Collections

A Hemingway Selection, edited by Dennis Pepper. 1972.
The Enduring Hemingway, edited by Charles Scribner, Jr. 1974.
88 Poems, edited by Nicholas Gerogiannis. 1979; as Complete Poems, 1983.
Selected Letters 1917-1961, edited by Carlos Baker. 1981.
Screenplays (documentaries): Spain in Flames, with others, 1937. The Spanish Earth, 1937.

Verse

Collected Poems. 1960.

Other

Death in the Afternoon. 1932.
Green Hills of Africa. 1935.
The Hemingway Reader, edited by Charles Poore. 1953.
Hemingway: The Wild Years (newspaper articles), edited by Gene Z. Hanrahan. 1962.
A Moveable Feast (autobiography). 1964.
By Line: Hemingway, Selected Articles and Dispatches of Four Decades, edited by William White. 1967.
Hemingway: Cub Reporter: "Kansas City Star" Stories, edited by Matthew J. Bruccoli. 1970.
The Faithful Bull (for children). 1980.
Hemingway on Writing, edited by Larry W. Phillips. 1984.
The Dangerous Summer. 1985.
Dateline: Toronto: The Complete Toronto Star Dispatches 1920 to 1924, edited by William White. 1985.

Editor Men at War: The Best War Stories of All Time. 1942.

Bibliography: Hemingway: A Comprehensive Bibliography by Audre Hanneman, 1967, supplement, 1975; Hemingway: A Reference Guide by Linda W. Wagner, 1977.

Critical Studies: Hemingway: The Writer as Artist, 1952, revised edition 1972, and Hemingway: A Life Story, 1969, both by Carlos Baker, and Hemingway and His Critics: An International Anthology edited by Baker, 1961; Hemingway by Philip Young, 1952, revised edition, as Hemingway: A Reconsideration, 1966; Hemingway by Stewart F. Sanderson, 1961; Hemingway: A Collection of Critical Essays edited by Robert P. Weeks, 1962; Hemingway by Earl Rovit, 1963; Hemingway:

An Introduction and Interpretation by Sheridan Baker, 1967; Hemingway and the Pursuit of Heroism by Leo Gurko, 1968; Hemingway's Nonfiction: The Public Voice by Robert O. Stephens, 1968, and Hemingway: The Critical Reception edited by Stephens, 1977; Hemingway: The Inward Terrain by Richard B. Hovey, 1968; Hemingway's Heroes by Delbert E. Wylder, 1969; Hemingway: The Writer's Art of Self-Defence by Jackson R. Benson, 1969, and The Short Stories of Hemingway: Critical Essays edited by Benson, 1975; A Reader's Guide to Hemingway by Arthur Waldhorn, 1972; Hemingway's Craft by Sheldon Norman Grebstein, 1973; Hemingway: Five Decades of Criticism edited by Linda W. Wagner, 1974, and Hemingway and Faulkner: Inventors/Masters by Wagner, 1975; By Force of Will: The Life ad Art of Hemingway by Scott Donaldson, 1977; Scott and Ernest: The Authority of Failure and the Authority of Success by Matthew J. Bruccoli, 1978, and Conversations with hemingway (interviews) edited by Bruccoli, 1986; Hemingway and His World by Anthony Burgess, 1978; The Tragic Art of Hemingway by Wirt Williams, 1981; Hemingway: The Critical Heritage edited by Jeffrey Meyers, 1982, and Hemingway: A Biography by Meyers, 1985; Hemingway's Nick Adams by Joseph M. Flora, 1982; Hemingway by Samuel Shaw, 1982; Hemingway: New Critical Essays edited by A. Robert Lee, 1983; The Hemingway Women by Bernice Kert, 1983; Hemingway and The Sun Also Rises: The Crafting of a Style by Frederic J. Svoboda, 1983; Hemingway: The Writer in Context edited by James Nagel, 1984; Concealments in Hemingway's Work by Gerry Brenner, 1984; Hemingway: Life and Works (chronology) by Gerald B. Nelson and Glory Jones, 1984; Cassandra's Daughters: women in Hemingway by Roger Whitlow, 1984; The Young Hemingway by Michael Reynolds, 1986.

ادراکِ حقیقی کا ناول نگار

جان سٹین بک

امریکی ناول نگاروں میں اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ٹھوس تجربات کے حوالے سے
جان سٹین بک واحد ناول نگار ہے، جسے تحسین و تردید، کامیابی اور ناکامی، شہرت و بدنامی
اور خوشی و المیے کا بیک وقت سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس قدر محدود ہے کہ ایک سطح پر اس
کا موضوعی اور فکری لینڈ سکیپ کیلی فورنیا کی سرحدوں میں بند ہو کر رہ جاتا ہے اور
دوسری سطح پر ساری دنیا کے لوگ اس میں سمٹے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ متنوع اسلوب نگاری
کا تخلیق کار ہے جو سرحدوں میں قید ہو کر بھی آفاق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نے اپنی
زندگی میں ہر قدم پر ناکامیوں کو سامنے کھڑا پایا اور ہر ناکامی کے وجود میں اپنے لئے کامیابی
کی راہ بنائی۔ وہ ایک ایسا طبقاتی شعور رکھنے والا کہانی کار ہے، جس نے بیسویں صدی
کے اوائل کی امریکی معاشرت کو پوری توانائیوں کے ساتھ پیش کر کے اپنے لئے مستقبل
میں امکانات روشن کئے۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خود بسر کیا۔ کھیت مزدور،
فیکٹری مزدور، کیرٹیکر اور سمندر کی موجوں سے لڑنے والے ایک باہمت نوجوان سے
لے کر دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام نوبیل کی منزلوں پر پہنچنے تک اس نے زندگی کے

ایک ایک لمحے سے حظ اٹھایا۔

جان سٹین بک کیلی فورنیا کی وسطی وادی سالینا رمیں ۲۷رفروری ۱۹۰۲رمیں پیدا ہوا۔ یہ وہی سال ہے جب کیلی فورنیا کے دو ممتاز ادیب برٹ ہارٹی BRET HORTE اور فرینک نورز FRANK NORRIS فوت ہوئے۔ان دونوں ادیبوں کے فن کی طرح جان کی تخلیق کا خمیر بھی کیلی فورنیا کی مٹی سے اٹھتا ہے مگر وہ اپنے کسی فن پارے میں ایک علاقائی ادیب کی حیثیت میں نظر نہیں آتا ہے۔ وہ اپنے گھر گلی، علاقے، شہر اور ریاست کو ساری دنیا میں ان ہی حالات کا شکار لوگوں کی بستی بنا دیتا ہے۔ اس کی تخلیقات

THE LONG VALLEY OF MICE AND MAN DUBIOUS BATTLE

THE GRAPES OF WRATH کا موضوعی استغراق مقامی فکر کی نیابت کرتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا حوالہ آفاقیت پر پھیل جاتا ہے۔ جان سٹین بک کے ادب میں کیلی فورنیا پوری توانائیوں کے ساتھ اجاگر ہے، جہاں اس نے جنم لیا اور اس کے آباء نے اپنی زندگیاں بسر کیں۔

جان سٹین بک کے والد جرمن (دوسل ڈارف کی قریبی بستی البرفیلڈ) کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے دادا نقل مکانی کرکے کیلی فورنیا میں آکر آباد ہو گئے، جان سٹین بک کے والد جان ارنسٹ سٹین بک فلوریڈا میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۰رمیں ان کی شادی آئرلینڈ (لنڈن ڈیری) سے ہجرت کرکے مونٹیرے کاونٹی میں آباد سیموئیل ہملٹن کی صاحب زادی اولیوا ہملٹن سے ہوئی جو ایک سکول ٹیچر تھیں۔ اس دور میں سالینا ز SALINAZ ایک زرعی تجارتی مرکز تھا۔ اس میں مویشی باڑوں اور کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا، جو ساحلِ سمندر تک چلا جاتا تھا۔ سٹین بک کے والد آٹا پیسنے کے کاروبار سے منسلک تھے، مگر بعد ازاں وہ یہ کاروبار ترک

کرکے مونٹیسرے کاؤنٹی میں خزانہ دار بھرتی ہو گئے، جہاں وہ ۱۹۲۶ء تک کام کرتے رہے۔
جان سٹین بک کو چھ سال کی عمر میں سالیناز پبلک ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس نے جلد ہی ایک ایسے ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت حاصل کر لی جو تعلیم اور کھیل میں یکساں دوسروں سے آگے تھے۔ جہاں وہ ایک طرف ٹریکنگ اور باسکٹ بال کا ایک اچھا کھلاڑی ثابت ہوا۔ وہیں مختلف مضامین میں گہری دلچسپی رکھنے کے باعث اپنے سکول میگزین میں مضامین لکھنے کے حوالے سے بھی دوسروں سے ممیز ہونے لگا اور جلد ہی بڑی جماعتوں کے طلبا کی تنظیم کا صدر بن گیا۔ لکھنے اور پڑھنے کی طرف اس کا رجحان ان کتابوں کے توسط سے ہوا جو اس کی والدہ نے گھر میں جمع کر رکھی تھیں، وہ سکول ٹیچر تھیں اور ادب سے دلچسپی رکھتی تھیں، یہی دلچسپی جان سٹین بک کی ادب کی طرف رغبت کا سبب بنی۔ اس نے پہلی بار جین گرے، جیمس اولیور کروڈ، جیمس برانچ کیبل کے ناول اپنے گھر کی لائبریری سے پڑھے۔ پھر مونیٹرے کی قریبی کاؤنٹی کے ایک ممتاز کیلیفورنین ادیب رابرٹ لوئیس سٹیونسن کی ادبی تخلیقات پڑھنے کا موقع ملا، جس سے اس کے اندر لکھنے کی صلاحیت نے جلا پائی۔ وہ اپنے بچپن کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے جرم و سزا (دوستوفسکی) مادام بوواری NASTURE AND MYTH اور جنت گم گشتہ (ملٹن) کی کتابیں پڑھیں، اس نے بچپن میں ہی سکول اور گرجے میں بائبل کا مطالعہ بھی کیا اور یہی سب کچھ اس کے اسلوب اور فکر پر اثر انداز ہوئے۔ یہیں سے اس کے ادب کی ہیت، زبان اور تکنیک بھی تشکیل پاتی نظر آتی ہے، جس کا بہترین اظہار بعد ازاں اس کے ناولوں میں ہوا۔
جان سٹین بک نے ۱۷سال کی عمر میں پبلک سکول سے گریجویشن مکمل کی اور ۱۹۱۹ء سٹین فورڈ STANFORD میں داخل ہوا، جہاں وہ ۱۹۲۵ء تک پڑھا۔

مگر اس نے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کسی امتحان میں شرکت نہیں کی اور نہ ہی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل کی، اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کہ اس نے یونیورسٹی سے ڈگری کیوں حاصل نہ کی، مگر مقام حیرت ہے کہ وہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں زیرِ تعلیم رہا ہے۔ اس نے تمام مضامین پڑھے جس میں بحری حیاتیات MARIN BIOLOGY بھی شامل ہے لیکن کسی ایک مضمون میں بھی ایک مکمل تعلیمی سال نہیں لگایا، وہ کچھ عرصہ کسی ایک مضمون میں داخلہ لیتا اور سال کی باقی مدت محنت مزدوری پر صرف کرتا، جن میں سڑکوں کی تعمیر میں اور ایک چینی کے کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرنا بھی شامل ہے۔ اس دوران میں یونیورسٹی کے درسیات کے استاد EDITH RONALD MARRIELESS کے زیرِ اثر آیا، جو اسے افسانہ نگاری کے فن پر لیکچر دیا کرتا تھا اور اسی دور میں اس نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنا کیریئر انتخاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے والدین اسے وکیل بنانا چاہتے تھے اور وہ اپنے متعینہ انداز میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک کارگو بحری جہاز سے نیویارک کی طرف روانہ ہوا اور جب نیویارک کی بندرگاہ پر اترا، تو اس کی جیب میں صرف تین ڈالر تھے۔

نیویارک آنے کے بعد اس نے اپنے بہنوئی سے کچھ رقم حاصل کی اور میڈسن سکوائر کے ایک باغ میں مزدوری کرنے لگا۔ جہاں وہ شدید سردی کے موسم میں بجری اور سیمنٹ کی بھری ہوئی ٹرالیوں کو کھینچتا۔ دس بارہ اور کبھی کبھی اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ جب یہاں کام ختم ہو گیا تو اس کے ایک رشتہ دار نے جو ایڈورٹائزنگ کا کام کرتا تھا ایک جریدے "امریکن" میں رپورٹر کی حیثیت سے ملازم کرا دیا۔ اب اسے ۱۰۰ ڈالر ملنے لگے تھے۔ اس جریدے میں اسے مختلف کام کرنے پڑے جن میں انسانی دلچسپی کے

مضامین اور جرائم کی خبریں جمع کرنا بھی تھا، مگر جلد ہی اس کی طبیعت اکتا گئی اور آزاد صحافی کی حیثیت سے مختلف جرائد میں کہانیاں اور مضامین لکھ کر گزر بسر کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اسی دوران رابرٹ میکرائڈ کمپنی کے ایک ایڈیٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اپنا مسودہ اشاعت کے لئے دینے کو کہا اور جب وہ مسودہ لے کر پہنچا تو ایڈیٹر تبدیل ہو چکا تھا اور نئی انتظامیہ نے مسودے کی اشاعت سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت شور مچایا مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اور جب محنت مزدوری سے جمع پونجی خرچ ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تو دوبارہ مزدوری کرنے لگا۔ ان ہی دنوں نیویارک میں اس کا ایک دوست ملا۔ جس نے اسے دعوت دی کہ اگر وہ کیلی فورنیا واپس چلے تو وہ کارگو جہاز پر ملازمت دلا سکتا ہے۔ وہ بادل نخواستہ نیویارک چھوڑنے پر آمادہ ہوا، وہ نیویارک سے خود کو اس قدر دکھی محسوس کر رہا تھا کہ جب وہ دوبارہ ناول نگار کی حیثیت سے نیویارک میں داخل ہوا، تب بھی وہ اس مختصر قیام کی تلخی کو فراموش نہ کر سکا۔

کیلی فورنیا لوٹنے کے بعد بھی کہیں ٹک کر کام نہ کر سکا۔ کبھی وہ کیئر ٹیکر کی حیثیت سے ایک عمارت میں کام کرتا تو کبھی جہازوں کے سلسلے میں محنت مزدوری پر گزر ہوتی۔ اس نے ایک مچھلی فارم میں باقاعدہ کام شروع کر دیا اور پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنا پہلا ناول "سونے کا پیالہ" CUP OF GOLD لکھا، جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا، یہ کتاب نقادوں اور قارئین کی توجہ مبذول نہ کرا سکی، تاہم اس نے "مجھے قبل از وقت شعوری بلوغت سے ہمکنار کرایا ہے اور یہ یقین دیا ہے کہ میں بحیثیت ادیب خود کو منوا سکتا ہوں۔" [۲۸]

گو ایسا نہ ہو سکا اور اوپر نیچے چار ناول اس کے مالی مسائل میں کمی نہ کر سکے۔

۱۹۳۰ء میں اس نے زندگی کا نیا سفر شروع کیا اور لاس اینجلس میں جاکر کیرول ہیننگ سے شادی کر لی اور کئی مہینے یہاں قیام کیا۔ ۱۹۳۲ء سالیناز آنے کے بعد اپنے والد کے مکان میں رہنے لگا۔ اسے باپ کی طرف سے مالی اعانت بھی حاصل تھی جو ان دونوں کے لئے ناکافی تھی۔ اخراجات پورے کرنے کے لئے مچھلیاں پکڑتا اور ادھر اُدھر کام کر کے گزر اوقات کرتا۔ پیسفک گروو PACIFIC GROVE جو مونیٹرے سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور جہاں جان سٹین بک رہائش پذیر تھا۔ اس جزیرہ نما میں تین برادریاں رہتی تھیں جن میں سے دو برادریاں CARMEL اور MONTEREY ادب، آرٹس، نائٹ کلب اور دیگر سماجی تفریحات کی سرپرستی کرتیں، جبکہ تیسری برادری سخت مذہبی اور ان تمام سرگرمیوں کو بے ہودگی سمجھتی تھیں، اس ماحول میں سٹین بک کو سات برس تک رہنا پڑا، یہاں اس کی ملاقات ایڈورڈ ایف ریکیٹ EDWARD F. RICKETTS سے ہوئی جو دوستی میں بدل گئی، ایڈورڈ ریکیٹ نے جو ایک بحری حیاتیات کی لیبارٹری کا مالک تھا، جان سٹین بک کو بھی اس تحقیقاتی کام میں شامل ہونے کی ترغیب دی اور اپنے ساتھ کام پر لگا لیا، سٹین بک کے ادب میں اس دور کے گہرے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس دوران جان سٹین بک نے سوچا کہ اسے ایسے ناول لکھنے چاہیئں جن سے اس کی آمدنی بڑھ سکے تاکہ وہ اپنے سنجیدہ کام کو آسانی سے جاری رکھ سکے۔ اس خیال کے تحت اس نے DISSOMENT SYMOPHOUGI اور MURDER IN FULL MOON لکھے۔ اس نے پہلے ٹریش لٹریچر اپنے نام سے لکھنے پر ندامت محسوس کی، اور جب یہ ناول شائع ہونے والے تھے، اس نے ناشر سے واپس لے لئے اور اس مسودے پر کام شروع کر دیا، جو THE GREEN LADY کے نام سے

سات پبلشرز ں سے معذرت کے ساتھ واپس آگیا تھا، اب نئے نام ٹو این ان
ناؤن گاڈ TO AN UNKNOWN GOD سے دوبارہ لکھا اور ۱۹۲۱ء میں ناشر کے
حوالے کر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ایک کہانیوں کا مجموعہ THE PASTURE OF HEAVEN
شائع ہوا، مگر مالی طور پر زیادہ منفعت بخش ثابت نہ ہوسکا۔ اسی سال جان سٹین بک
لاس اینجل چلا گیا، جہاں سے وہ ۱۹۳۳ء میں واپس مونیٹرے آیا اور اسی سال اس کا ناول
TO A UNKNOWN GOD بھی شائع ہوا مگر اس کی پہلی دو کتابوں کی طرح
یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ تاہم یہاں سے اس کی شہرت اور بدنامی کا سفر ایک
ساتھ شروع ہوا۔ اس ناول کا شدید ردِعمل پیسفک گروہ PACIFIC GROVE کے
مذہبی حلقوں پر ہوا اور شہریوں کی کمیٹی نے پبلک لائبریری سے اس کی کتابیں ہٹانے اور جلانے
کا مطالبہ کر دیا۔ اس سال اس کی کہانیاں ادبی جریدے نارتھ امریکن ریویو NORTH
AMERICAN REVIEW میں شائع ہونے لگیں۔ ان میں سے ایک نے او ہنری کی
ادبی ایوارڈ برائے افسانہ ۱۹۳۴ء حاصل کر لیا اور اس کے بعد بھی شائع ہوتی رہیں لیکن
اس کی زیادہ تر توجہ اپنے ناول TO A GOD UNKNOWN نام میں قدرے تبدیلی کے ساتھ
پر رہی۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے اپنے نئے ناول کے مسودے کو اپنے ایجنٹ کے حوالے کیا'
جو گیارہ ناشروں کی طرف سے رد کیے جانے کے بعد TORTILLA FLAT کے نام
سے ایک نئے پبلشنگ ادارے نے شائع کیا۔ اس ناول کے شائع ہوتے ہی جان
سٹین بک کے قارئین کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹورٹیلا فلیٹ
کئی ماہ تک BEST SELLER کی فہرست میں آویزاں رہا۔ مگر ساتھ ہی ایک
حلقے پر اس کا شدید منفی اثر بھی پڑا اور مونیٹرے کے ایوانِ صنعت و تجارت نے
اس کی شدید مذمت کی اور اس کی ضبطی کا مطالبہ کیا، ان کے خیال میں اس ناول میں

جس طرح علاقے کو پیش کیا گیا وہ سیاحوں کے علاقے میں بڑا اثر ڈالے گا۔ قدرت جان سٹین بک کے ساتھ دلچسپ مذاق کر رہی تھی، ایک طرف اس کی مذمت ہو رہی تھی اور دوسری طرف ۱۹۳۵ء میں کامن ویلتھ کلب آف کیلی فورنیا نے کامیاب ناول لکھنے پر اسے سونے کا تمغہ عطا کیا اور پیراماؤنٹ پکچرز نے اس پر فلم بنانے کے لئے ہزاروں پاؤنڈ معاوضہ ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسی سال اس نے اپنے ناول کے ناشر COVICI FREIDE کے ساتھ چھ ناولوں کا معاہدہ کر لیا۔

جان سٹین بک کے ان ناولوں کا فکری اور فنی پس منظر جس طرح مرتب ہوا، اس سے واضح طور پر اس کی تخلیق کے بارے میں دو طبقے نظر آتے ہیں۔ ایک جو سٹین بک کی تخلیقات کو حقیقی تصویریں سمجھ کر قبول کرتا اور دوسرا اس حقیقی تصویروں کے انکشاف پر سٹین بک کو رد کرتا ہے۔ مومعاشرے کی سماجی تنظیم اور ایوانِ صنعت و تجارت کا رویہ دوسرے طبقے میں شامل ہے۔ جان سٹین بک کے مکان تک نثر اور فکری سرحدوں پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے اور ساتھ ہی نقادوں نے ان وجوہ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی، جن کا شعوری اور لاشعوری ہر دو سطحوں پر جان سٹین بک کو سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔
جان سٹین بک کے ایک نقاد فری مین شیمپنی FREEMAN CHAMPONY نے اپنے مضمون "کیلی فورنیا" میں جان کے ذہن میں آباد کیلی فورنیا کی تلخ زندگی کے بارے میں بڑی وضاحت سے بحث کی ہے۔
"جان سٹین بک امریکہ کے ان چند ناول نگاروں میں سے ایک ہے جو ماضی اور مستقبل پر بخوبی بحث کر سکتے ہیں۔" فری مین جان سٹین بک کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ جان سٹین بک پر زیادہ تر مشرقی امریکی نقادوں نے لکھا جو سٹین بک کے ماحول اور معاشرے کے بارے میں

بالکل نہیں جانتے۔ اس لئے ان کی تنقید میں تعصبانہ عناصر غالب ہیں اور کسی ادیب پر معتبر انداز میں بات کرنے کے لئے اس کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جس کو وہ تخلیق کرتا ہے۔[?] فری مین جان سٹین بک کے جنم بھومی کے جغرافیے پر طویل گفتگو کرنے کے بعد پوری امریکی سوسائٹی کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتا ہے کہ امریکی سوسائٹی مختلف جزیروں میں تقسیم ہے اور ایک جزیرے کی ثقافت اور ماحولیات کو دوسرے حصے تک دراز کرنا نہایت مشکل ہے مگر امریکی مجموعی طور پر امید پرست' افادی، تیز رفتار، گروہ پسند' توانائی سے بھرپور اور اخلاقی قدروں کے حامی ہونے کے ناطے مضبوط معاشرتی اقدار کی حامل قوم ہے۔ معاشی اور معاشرتی مضبوطی کا یہ تصور مغربی وسطی امریکہ میں زیادہ اور بعید مغرب خصوصاً جان سٹین بک کے علاقے میں قدرے کمزور ہے۔ فری مین چالیس کی دہائی میں کیلی فورنیا کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے،" یہ صرف سو برس قبل دنیا کے جغرافیے پر ظاہر ہوا اور جب تک تارکین وطن نے آکر آباد نہ کیا اس کے بیشتر علاقے غیر آباد تھے، چنانچہ یہ امریکہ کے دوسرے علاقوں کی نسبت معاشی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر پسماندہ تھا۔ سٹین بک کا کمال فن ہے کہ اس نے ان علاقے کے لوگوں کو، زمین کو اور مسائل کو اپنے فن میں سمویا جو اس کے اردگرد آباد تھا۔ اس نے کیلی فورنیا اور خصوصاً سالیناز، مونیٹرے اور وادی کے دیگر مسائل کو پوری امریکی سوسائٹی پر منطبق کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ یہاں اس کا نقطہ نظر مارکسی انداز میں پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔

وہ بسا اوقات معاشرتی رویوں پر شدید نکتہ چینی کرتا ہے۔

THE THINGS WE ADMIR IN MAN. KINDNESS AND GENEROSITY, PENNESS. HONESTY. UNDERSTANDING AND FEELING ARE THE ONCOMITANTS OF FAILURE IN OUR SYSTEM. AND THOS TRAITS WE DETEST. SHORPNESS. GREED. EQUISITIRENESS MEANNESS AND SELF INTEREST ARE TRAITS OF SUCCESS."

درج بالا اقتباس میں شدتِ اظہار اور اس وقت کی معاشرت پر جان سٹین بک کا سخت تبصرہ، اس کے فکری علائق میں برانگیخت کر دینے والے ردِ عمل کو جنم دیتا ہے یہ ردِ عمل اس کے نظریاتی ایقان کا حصّہ بھی ہے اور اسے ہم سالیناز کے ابھرتے ہوئے معاشرے میں عام آدمی کی سوچ اور ردِ عمل سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

سٹین بک کے اب تک کی تخلیقات میں (اور اس کے بعد میں بھی) کردار سازی کا عمل زیادہ منضبط ہے۔ کردار ہی اصلاً حقیقت نگاری میں معاون ہوتے ہیں۔ جان سٹین بک نے کردار سازی اور کہانی کی بنت میں تاریخ اور مائی تھالوجی دونوں سہارے کے طور پر پس منظر میں استعمال کیا ہے جس سے کہانی اور کردار زیادہ طاقتور تاثر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

"کپ آف گولڈ" تاریخی اساطیر کی مدد سے عصر کی علامتی نمائندگی ہے۔ جبکہ "ٹو اے گاڈ ان نان" میں مذہبی دیو مالا کو استعمال کیا گیا۔ مارلن کا پُراسرار کردار اور مورگن کا عروج و زوال تاریخی پس منظر میں عصر کی کہانی سناتا ہے۔ اس کہانی کے کردار گو یک سطحی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں، لیکن جان سٹین بک ان کرداروں سے پہلو در پہلو معانی قاری تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ "کپ آف گولڈ" تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر مکمل ناکامی کے بعد جب دوبارہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تب بھی اس کی فروخت کا گراف ۱۵۳۳ کتابوں سے اوپر نہ اُٹھ سکا۔ TO A GOD UNKNOWN کے بارے میں نقادوں نے مختلف جائزے پیش کئے ہیں مگر ایک بات پر سب متفق ہیں کہ جان سٹین بک نے

اس ناول میں مذہب اور متھ کو بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کیا۔ اس ناول کو دیکھتے ہوئے ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ جان سٹین بک نے دنیا کے مذہب اور دیومالا اساطیر اور داستانوں کو پڑھ رکھا تھا، جو اس کے وسیع مطالعے پر دال ہے۔ "ٹو اے گاڈ ان ناؤن" میں عیسائیت اور ہندومت کو بڑے خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔

یہ ایک ایسے جدید انسان کی کہانی ہے جو صدی کے موڑ پر ماضی اور حال کے دروازے پر کھڑا زمین سے اپنی عقیدت اور محبت کو اجاگر کر رہا ہے۔ زمین اس کے لئے ایک محبوبہ کا روپ رکھتی ہے۔ کپ آف گولڈ کے برعکس جس میں جان سٹین بک نے تاریخی اور یورپی لیجنڈ کے محدود زاویے میں کہانی کو پیش کیا تھا، اس میں اس کا کینوس وسیع تر ہے۔

جوزف اپنے تین بھائیوں اور والدہ کے ساتھ رہتا ہے، مگر بعد ازاں جب اس کا خاندان کیلی فورنیا منتقل ہو جاتا ہے تو وہ ان کے ساتھ نہیں آتا تاہم باپ کے مرنے کے بعد اسے اپنے بھائیوں کے پاس آنا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ان کے ساتھ کام کرتا، شادی کرکے ایک بچے کا باپ بن جاتا ہے۔ یہاں ایک اور حادثہ جنم لیتا ہے۔ اس کی بیوی مر جاتی ہے۔ یہاں جوزف کے اندر ہنگام۔ اس کی بیوی کی ہلاکت یا مالی بحران سے جنم نہیں لیتا جبکہ علامتی طور پر وہ اس ساری صورت حال کو اپنے اندر جذب کرکے فکری سطح پر نئے جہان میں قدم رکھتا اور رفتہ رفتہ وحدت الوجودی فلسفہ پر اس کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ یہاں اس کے سامنے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں "وہ کون ہے جس کے لئے ہم قربانیاں پیش کرتے ہیں" وہ سوال اٹھاتا ہے اور بغیر حل کئے چھوڑ دیتا ہے۔ "وہ خداؤں کا خدا ــــــ جس کی ہم حمد کرتے ہیں اور اس

کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے" مگر ان " نامعلوم خدا " کے بارے میں نہ جانتے ہوئے بھی کئی مثبت پہلو ابھرتے ہیں" وہ ہمیں نقصان نہیں دے گا، اس کے اندر بے شمار بے چین پرول میں ایک اطمینان بھی ہے۔" وہ جس نے زمین اور آسمان بنائے، جس نے چمکتا ہوا سمندر بنایا۔" یہاں پہنچنے کے بعد راما ایک مکمل علامتی مذہبی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس مرحلے پر دو مذاہب باہم مربوط نظر آتے ہیں۔ راما قدیم ہندو مائی تھالوجی کا کردار ہے، تو" نامعلوم خدا " پر اعتقاد عیسائی مذہبی علائق میں علامت تخلیق کرتا ہے۔ اس کہانی میں ہندو وحدت الوجود کے فلسفے اور عیسائی روح القدس کے فلسفے میں ایک خوبصورت توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔

دادی کا نام ہمارے مقدس خاتون OUR LADY اوّلین علامت کے طور پر سامنے آتا ہے اور دھرتی ماتا EARTH MOTHER دوسری اہم علامت کے طور پر۔ پہلی علامت عیسائیت سے مستعار ہے تو دوسری ہندومت سے۔ یہ دونوں حوالے رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہوئی کہانی میں واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مقدّس خاتون اور دھرتی ماتا کے درمیان توازن اس کہانی کا کمال فن ہے، مگر بعض مقامات پر یہ توازن متزلزل بھی ہوتا ہے جب دھرتی ماتا مقدس خاتون سے زیادہ بلیغ علامت کے طور پر زیر بحث آتی ہے۔ جب وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر باہر جاتا ہے، تو اس کے اندر کھیتوں کی ہریالی، زرخیزی، اس کے حسی ادراک میں جمالیاتی تصوّر کی ایک دنیا آباد کرتی نظر آتی ہے اور اس کے اندر احساس اُبھرتا ہے جیسے وہ ابھی کسی خوبصورت دوشیزہ سے ہم آغوش ہو کر آیا ہو، یہ حوالہ قدیم ہندو دیو مالا اور عیسائی فلسفے کے توازن سے جنم لیتا ہے۔" دھرتی ماتا " اور " مقدس خاتون کا جنگل " جنسی آسودگی جیسی فضا کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں ۔

جان سٹین بک کے ابتدائی ناولوں کو ہم عظیم ناول قرار نہیں دے سکتے مگر فکری، فنی اور موضوعی اعتبار سے ایسے بھی نہ تھے کہ ادبی طور پر قبولیت حاصل نہ کرتے۔ ان ناولوں میں اس نے وسیع مطالعے، فطری مشاہدے اور مضبوط کرافٹ شپ کا مظاہرہ کیا ہے اور کہانی کو دلچسپ پیرائے اور فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ جدید تکنیک میں پیش کیا ہے۔

"ٹورٹیلا فلیٹ" کی کامیابی کے بعد اب جان سٹین بک کے ناولوں کے لئے، پڑھنے والوں کا جہاں ایک وسیع حلقہ مل گیا تھا، وہیں نقادوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر کام شروع کیا اور ساتھ ہی کامیابیوں کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جب ۱۹۳۶ء میں اس کی نئی تخلیق DUBIOUS BATTLE شائع ہوئی اور اس نے دولتِ مشترکہ کا ایوارڈ حاصل کیا تو اس خوشی کے ساتھ ایک المیہ اس کا انتظار کر رہا تھا، ایک طرف اس کی بیوی کیرول ساحلی دھند کی وجہ سے بعض جسمانی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی اور اسے پیسیفک گروو چھوڑ کر کوہ سانتا کروز میں اپنا مکان بنا کر منتقل ہونا پڑا۔ دوسری طرف اس کے والد ارنسٹ جان سٹین بک کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۳۶ء میں ہی بک نے تارکینِ وطن کے مسائل پر مشتمل کہانیوں کی اشاعت کا سلسلہ SAN FRANCISCO NEWS میں دی ہاروسٹ جپسیز THE HARVEST GYPSIES کے نام سے شروع ہوا۔

۱۹۳۷ء بہرحال اس کے لئے کامیابیوں کا نیا سال تھا۔ گو اس سال اس کی کئی کہانیاں مختلف جرائد سے معذرت کے ساتھ واپس بھی لوٹائی گئیں لیکن کئی دیگر کہانیاں ملک کے معروف جرائد میں شائع ہوئیں، جن میں THE PROMISE اور THE EARS OF JOHNNY BEAR شامل تھیں جو بعد ازاں REDPONY کے نام سے شائع ہوئیں۔ چند اس کے نئے ناول OF MICE AND MEN (آف مائس اینڈ مین)

کو اشاعت کے ساتھ ہی قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ میسر آیا۔ اسی سال وہ سان فرانسسکو سے اپنی بیوی کیرول کے ہمراہ نیویارک پہنچا۔ جہاں سے مارچ کے آواخر میں اپنی بیوی کی معیت میں وہ یورپ کی سیاحت کو نکلا۔ روس، سکنڈے نیویا، اور اپنے آباء کے وطن آئرلینڈ سے ہوتا ہوا تین ماہ کے بعد نیویارک واپس آگیا۔ نیویارک میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ ریاست بک BUCK میں جارج کف مین کے فارم میں قیام پذیر ہوا اور یہیں اس کے ناولٹ "آف ماتس اینڈ مین" کو فلمایا گیا، جن کا خاطر خواہ معاوضہ حاصل ہوا۔ اس سال اُسے DRAMA CRITICS CIRCLE AWARD ملا۔

سٹین بک کو شہرت سے نفرت تھی۔ وہ پریس اور کیمرے کے سامنے آنے سے کتراتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے پوری زندگی میں صرف چند مرتبہ پریس کا سامنا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے پہلے انعام یافتہ ڈرامے کے افتتاحی شو میں وہ موجود نہ تھا اور کھیل شروع ہونے سے قبل ہی شہر چھوڑ کر کیلی فورنیا روانہ ہوگیا۔ کیلی فورنیا آنے کے بعد اس نے تارکینِ وطن کے مسائل میں عملی حصّہ لینا شروع کیا۔ وہ یہ سب کچھ اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ اپنے نئے ناول کے لئے مواد جمع کرے بلکہ وہ حقیقتاً تارکینِ وطن کے ساتھ روا ناانصافیوں اور دُکھوں کے تدارک کے لئے کام کرنے لگا تھا۔ انہی دنوں اس نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ تخلیقی عمل روک کر ہالی وڈ جاکر اپنے ناول "آف ماتس اینڈ مین" پر فلم بنائے اور اس کہانی سے تارکِ وطن لوگوں کی مدد کرے، جو اس وقت نہ صرف معاشی اور معاشرتی مسائل سے دوچار تھے بلکہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے اور جنہیں کوئی طبی سہولت حاصل نہ تھی۔ ان میں سے بعض متعدی امراض کا شکار ہونے کے سبب قرنطینہ میں ایک ٹینٹ میں تھے۔ ان میں دو خواتین حاملہ تھیں اور ان کے دن پورے تھے۔ اس صورتِ حال کا جان سٹین بک وادی میں لڑی جانے والی سول جنگ سے

موازنہ کرتا اور دُکھ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں جریدے "لائف" نے جان سٹین بک سے معاہدہ کرلیا کہ وہ تارکین وطن کے حالات پر فیچر تحریر کرے اور تصاویر کے ساتھ جریدے کو بھیجے۔

جان سٹین بک کو اس سلسلہ مضامین کا خاصا معاوضہ ملنے لگا، لیکن اس نے سوائے اصل خرچ کے ایک پیسہ بھی قبول نہ کیا اور ساری رقم بعض تارکین وطن کے لئے مختص کردی۔ اسی سال اس کا غیر ادبی پمفلٹ THE BLOOD IS STRONG شائع ہوا جبکہ ادبی تخلیقات میں سے دی لانگ ویلی THE LONG VALLEY منظرِ عام پر آیا۔

جان سٹین بک عجیب طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ فن اور پروپیگنڈا کے درمیان فرق رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذاتی نمائش کا بُری طرح مخالف تھا۔ وہ کسی ایسے شو میں کبھی شریک نہ ہوا جہاں اس کی شہرت یا شو کا گمان ہو۔ ۱۹۳۹ء اپریل میں جب گریپس آف ریتھ THE GRAPES OF WRATH شائع ہوا تو آن واحد میں اس کے خلاف اور حق میں قومی سطح پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ناول پر پابندی لگی، اس کی کاپیوں کو جلا دیا گیا۔ اخبارات میں بحث کا موضوع بنا، چرچ منبر سے اس کے خلاف شدید ردِعمل سامنے آیا مگر سکالرز اور قارئین کے نزدیک شاہکار کی حیثیت سے تحسین حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے ایڈیشن کی ڈھائی لاکھ تعداد ختم ہوگئی، جو اس وقت کی ادبی تاریخ کی سب سے بڑی فروخت کی تعداد تھی، جان سٹین بک کو کمیونسٹ قرار دے کر اسے انقلاب کا آرزو مند کہا گیا، یہاں تک کہ پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک رکن پارلیمنٹ LYLE BOREIN نے سوال اٹھایا اور جان سٹین بک کی تخلیق کو شکستہ اور مخبوط الحواس ذہن کی "سیاہ دوزخی تخلیق" قرار دیا۔ مگر جان سٹین بک اب کامیابی کی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا۔ اب اس کا سفر بلندیوں کی طرف تھا۔ ایک طرف اس کے خلاف

ایک ہنگامہ بپا تھا، اور اس کی زندگی ختم کر دینے کی دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں، تو دوسری طرف اسے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹر کا رکن چن لیا گیا اور ناول کو PULLITZER PRIZE اور AMERICAN BOOK SELLER ایوارڈ سے نوازا گیا۔

لوگوں کی اس قدر حامی اور مخالف آرزوں نے جان سٹین بک کو نروس کر دیا اور بے چینی محسوس کرنے لگا۔ تقاریب اور پریس کے سامنے جانے سے وہ یوں بھی الرجک تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے وہ نیویارک سے اپنے دوست ریکٹ کے ساتھ فرار ہو کر سان فرانسسکو کے ساحلی علاقوں سے اپنے پسندیدہ تحقیقی کام بحری حیاتیات کے لئے پانی کے نمونے جمع کرنے لگا۔ اس سلسلہ میں وہ کیلی فورنیا کے ساحلوں میں کبھی کرایے کا بجرہ حاصل کر کے آوارہ خرامی کرتا رہا۔ ۱۹۴۰ء میں جان سٹین بک میکسیکو پہنچا، جہاں میکسیکو کی پسماندگی کے دور پر "بھولا ہوا گاؤں" FORGOTTEN VILLAGE نامی فلم بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ۱۹۴۱ء میں فلم کی تکمیل پر اس کی نئی تخلیق ریکٹ کے اشتراک سے SEA CORTEZ کے نام سے شائع ہوئی، اس میں جان سٹین بک کی ریکٹ کے ساتھ ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔

جان سٹین بک کیلی فورنیا کی وادیوں سے نیویارک کے شور شرابوں میں گم ہونے اور ایک زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہونے کے لئے خود کو آمادہ کر رہا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں ہالی وڈ میں فلم بندی کے دوران اس کی ملاقات ایک مشہور گلوکارہ گینڈولن کنگر GWYNDOLEN CONGER سے ہوئی، پھر ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا جو بالآخر دونوں کے مابین محبت کے نئے رشتوں کی استواری پر منتج ہوا۔ اسی دوران کیرول ہیننگ اور جان سٹین کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے جو ۱۹۴۲ء

میں اس کے دوفنی تخلیقات THE BOMS AWAY اور THE MOON IS DOWN کی اشاعت کے بعد دونوں میں علیٰحدگی کا سبب بنے۔

کیرول نے جان سٹین بک کے ساتھ مالی اعتبار سے زندگی کے نہایت تلخ دن گزارے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کے تخلیقی کاموں میں اس کی معاون ہی نہ تھی، بلکہ اس کے مالی مسائل کو کم کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ملازمت بھی کرتی رہی۔ اس نے اس کے تمام مسودے خود ٹائپ کئے تھے اور تخلیقی طور پر اس کے مشورے جان سٹین بک کا حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ استحکامت کا سبب بھی تھے۔ اس نے کئی ناولوں کے نام بھی تجویز کئے جن میں سے "دی گریپس آف ریتھ" بھی تھا۔ مگر دونوں کے درمیان علیٰحدگی کا سبب غالباً اولاد سے محرومی تھا چنانچہ جب کیرول سے طلاق کے بعد وہ نیو یارک پہنچا، تو کیلی فورنیا میں اس کا ماضی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

۱۹۴۳ء میں اس نے گینڈ ولن سے شادی کی اور ہیرالڈ ٹربیونل میں جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ یورپ کے جنگی علاقوں میں فرائض کی ادائیگی کے لئے روانہ ہو گیا، لندن، شمالی افریقہ اور بعد از ان اٹلی میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۴ء میں واپس آنے کے بعد جنگی موضوع پر اس نے فلم کے لئے دو سکرپٹ لکھے، جو لائف بوٹ LIFE BOAT کے نام سے TWENTIETH CENTURY FOX نے ۱۹۴۴ء میں پکچرائز کیا۔ جبکہ تمغہ برائے بینی A MEDASL FOR BANNY ہیرا ماؤنٹ پکچر نے ۱۹۴۵ء میں فلمایا۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی معرکتہ الارا تصنیف CANNERY ROW چھپ کر آئی۔ ۱۹۴۴ء میں ہی اس کے ہاں پہلے بیٹے تھامس کی پیدائش ہوئی تھی، ۱۹۴۶ء میں دوسرے بیٹے جان نے جنم لیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی دو کتابیں THE PEARL اور THE WAY WARD BUS

طبع ہوئی۔ اسی سال اس نے روس کا سفر کیا۔

اب اس کی ادبی زندگی ہر سطح پر عزت و احترام حاصل کر چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں جہاں اس کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کو امریکن اکادمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز کے لئے منتخب کیا گیا، وہیں اس کو ایک شدید ذہنی جھٹکا اس وقت ملا، جب اس کا عزیز ترین دوست اڈ ریکٹ مئی ۱۹۴۸ء میں انتقال کر گیا۔ ریکٹ کا اس کے ادب اور زندگی پر گہرا اثر تھا۔ چنانچہ جان سٹین بک کے لئے ریکٹ کی موت سانحہ ثابت ہوئی۔ اس نے ریکٹ کی یاد میں طویل مضمون بھی لکھا۔ ۱۹۴۹ء میں RED PONY پر فلم بنی۔ ۱۹۵۱ء میں THE LONG FROM THE SEA OF CORTEZ طبع ہوئی جس کا طویل دیباچہ اس کے مرحوم دوست اڈ ریکٹ کے بارے میں تھا۔

۱۹۵۰ء میں اس نے دوسری بیوی سے علیحدگی کے بعد الین سکاٹ سے شادی کر لی۔ اس دوران اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا اور پہلی بیوی سے طلاق نے اس کے اندر احساس جرم کو ابھارا، چنانچہ لاشعوری طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اپنی بیوی کو دینے لگا، جس کا اظہار اس کے ناول "دی جرنل آف اے ناول" THE JOURNAL OF A NOVEL سے ہوتا ہے۔

۱۹۵۲ء میں ایسٹ آف عدن EAST OF ADEN شائع ہوا۔ اسی سال اس نے یورپ کا دورہ کیا اور کئی جریدوں میں، جن میں کولیئرز COLLIERS بھی شامل ہے، مضامین اور سفرنامے لکھے۔

اپنی زندگی کے آخری عشرے میں اس نے زیادہ تر وقت سیر و سیاحت میں گزارا، تین ناول بھی لکھے، مگر وہ زیادہ شہرت نہ پا سکے۔

۱۹۵۷ء میں اس نے یورپ کے دورے کے دوران MORTE D'ARTHUR

پر تحقیق کا کام شروع کیا۔ جس کا اس کے ادب اور حیات پر گہرا اثر دکھائی دیتا ہے ـ
۱۹۵۹ء میں وہ تقریباً ایک سال سمرسٹ میں ٹھہرا۔ جہاں اس نے اپنا کام جاری رکھا ـ
۱۹۶۰ء میں یورپ سے واپسی اور ۱۹۶۱ء میں وہ دوبارہ یورپ آگیا۔ اس سے قبل
اسی سال اس کی کتاب " ٹریول ود چارلی TRAVEL WITH CHARLEY مکمل ہو
کر ۱۹۶۲ء میں طبع ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں اس کے طبعی زوال کے آغاز کا سال ہے۔ اس
پر پہلی بار عارضۂ قلب کا حملہ ہوا اور اسی سال اس نے اپنا آخری ناول THE WINTER
OF OUR DISCONTENT مکمل ہوا۔

۱۹۶۲ء اس کی زندگی کا ایک ایسا سال ہے۔ جس کے بارے میں ۱۹۲۹ء میں جب
اس نے پہلا ناول دی کپ آف گولڈ تحریر کیا تھا، اور بڑی طرح ناکام رہا تھا۔ کبھی سوچا
بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ادبی دنیا کے فلک الافلاک پر ایک عظیم ادیب کی طرح
ابھرے گا اور دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام نوبیل پرائز کا حقدار بنے گا۔
ستر کے عشرے میں داخل ہونے کے بعد اس کی تخلیقی سرگرمیاں اس رفتار سے جاری
نہ رہ سکی تھیں، جن کا مظاہرہ وہ اب تک کرتا چلا آیا تھا، مگر وہ سیر و سیاحت اور
آرام کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی کام میں بدستور مصروف رہا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ایک
حد تک اس کا نظریہ فن واضح ہو چکا تھا اور تخلیق کا وہ سارا زور جو اسے بے چین رکھتا
تھا، حرفوں کی صورت کاغذوں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں اس کی ناموری کا موجب تھا۔
جان سٹین بک کے نظریۂ فن کو سمجھنے کے لئے اس کے فکری زاویۂ نظر کو سمجھنا
نہایت ضروری ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ دُکھ اور عذاب بنی نوع انسان کے
گرد نہ ختم ہونے والا چکر ہے اگر کوئی انسان کے دُکھوں کو کم کرنے کے لئے کچھ کام کرنا
چاہے تو اس کام کو بڑے لوگ سٹیٹس کو STATUS QUO کے لئے خطرہ سمجھتے

ہوئے اسے فوراً ختم کردیتے ہیں اور جن لوگوں کے حالات کو بدلنے کے لئے وہ لکھتا ہے وہ اسے دیوتا تو قرار دے سکتے ہیں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ لوگ اس وقت تک تبدیلی کو رد کرتے ہیں جب تک نیستی انہیں چاروں طرف سے گھیر نہیں لیتی۔ جان سٹین بک کا نظریہ فن حقیقت نگاری' فطرت پسندی اور شعوری ادراک کی نیابت فکر سے جنم لیتا ہے۔ اس روایتی مفہوم سے قطع نظر کہ" فطرت پسندی فرد کو جذباتیت، معاشی، معاشرتی، ماحولیات اور حالات کے تابع بنا کر اسے خواہشات کی آزادی سے محروم کر دیتی ہے اور فطرت پسند ادیب جذباتیت کے غلبے کے سبب اخلاقی قدری استدلال سے محروم ہو جاتا ہے۔" سٹین بک اپنے نظریہ فن کی بنیاد یہیں سے رکھتا ہے کہ" جو ادیب پُر جوش جذبے کے ساتھ PASSION ATELY آدمی کی کاملیت PERFECTABILITY پر ایمان نہیں رکھتا اس میں قربانی کا جذبہ ہوتا ہے نہ وہ ادیب برادری کا رکن ہے"[۱۲]

جان سٹین بک جدید حسیات کا ایک ایسا تخلیق کار تھا، جس نے حقیقت اور فطرت کو باہم مربوط کر کے عصری کمٹمنٹ کا اظہار کیا۔ اسے اس بات کا مکمل درک حاصل ہے کہ معاشرے میں ایک ادیب کی ذمہ داری کیا ہے۔

ادب و فن تعمیرات زیادہ شعور کا مسئلہ ہے۔ اخلاقی اقدار بقول ہنری جیمس "ادب و فن کا مسئلہ اصلاً تعمیل EXECUTION کا مسئلہ ہے اور اخلاقیات ایک الگ معاملہ ہے۔"[۱۳]

جب جان سٹین بک اپنی معاشرتی ذمہ داریوں اور دُکھی انسان کی کاملیت کا ذمہ دار ہے، تو اخلاقی اقدار کی پاسداری از خود اس سارے عمل میں شامل ہے، لیکن جن اخلاقی اقدار کو وہ چیلنج کرتا ہے، وہ اصلاً "سٹیٹس کو" کی پاسدار قدریں ہیں، جن سے

تفریق طبقاتی تضادات اور خصوصاً سالیناز میں تارکین وطن کے مسائل حل طلب رہ جاتے ہیں۔ جان سٹین بک دیومالائی، مذہبی اور اساطیری علامتوں کے ساتھ اور کہیں براہِ راست اظہار کے ذریعے اپنے کردار اور معاشرے کی اذیتوں کو نہایت واضح انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے ارتھر اساطیر EUORPEAN ARTHERION LECEND کا بڑا سہارا لیا ہے۔ پہلے ناول سے آخری ناول تک (درمیان میں شائع ہوئے کئی ناولوں سے استثنات کے ساتھ) ارتھرین اساطیر اور علامتوں کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے اس کے اسلوب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک ۔ جس میں اساطیری علامتیں اور دیومالا بھرپور تشخص کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ دی کپ آف گولڈ، ٹولے گاڈ ان ناؤن وغیرہ ۔

دوسرا۔ جہاں مذہبی، معاشرتی، معاشی، علاقائی اور ثقافتی عناصر سہارا بنتے نظر آتے ہیں۔

وارن فرینچ نے THE END OF DREAM میں جواسس کی کتاب JHON STAIN BECK (پرنٹس ہال نیو جرسی ۱۹۶۲ء) میں شامل ہے۔ "آف مائس اینڈ مین" کو اس کے پہلے دور کی فاتح سے تعبیر کیا۔ وارن کے نزدیک جان سٹین بک کے اسلوب اور فکر کے پہلے دور" آف مائس اینڈ مین " کو اس کے پہلے دور کی فاتح سے تعبیر کیا۔ وارن کے نزدیک جان سٹین بک کے اسلوب اور فکر کے پہلے دور " آف مائس اینڈ مین " پر خاتمے کی کئی شہادتیں ملتی ہیں۔

۱ ۔ یہ پہلا تخلیقی کام ہے جو جان سٹین بک کو قومی سطح پر اس کے فن کا بھرپور انداز میں اعتراف کرتا ہے جو اس کے لئے بہت

بڑا ایوارڈ ہے اور انعامات کے لئے راستہ کھولتا ہے، اور
اسے بنی نوع انسان کے دکھوں کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ یہ
وہ مقام ہے جو خود اس کے کردار ڈینی TORTILLA FLAT
کی کامیابیوں کی وہ منزل ہے جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

۲۔ اس ناول میں جان سٹین بک کو تخلیق پیش کرنے کے لئے بالآخر
وہ ہیئت اور اسلوب حاصل ہو جاتا ہے، جس کے لئے وہ دوسری
تخلیق میں جد و جہد کرتا نظر آتا ہے۔ یہ کہانی کار کا ایک ایسا
معروضی طریق کار ہے جسے افسانوی ڈراما FECTIONALISED
PLAY کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور

۳۔ اس ناول میں جان سٹین بک آخر کار درک حاصل کر لیتا ہے کہ
وہ مسئلہ جو اس نے کپ آف گولڈ میں اٹھایا تھا، کس طرح
پیش کیا جا سکتا ہے، اس ناول نے اسے دیومالا، اساطیر
اور لیجنڈ میں قرب مسیح کی تلاش اور اصطلاحات کے لئے
زیر زمین مشقت سے بچالیا۔" آف مائس اینڈ مین" آرتھرین
لیجنڈ کے زیر اثر تخلیق ہونے والا آخری ناول ہے۔

یوں تو جان سٹین بک کے تمام ناول انفرادی جائزے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن
بعض ناولوں کو اس کے عصر کے بڑے نقادوں نے جس طرح داد و تحسین کا مستحق قرار
دیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ یعنی ناول اس کے فکری اور فنی استغراق کا بہترین نمونہ
ہیں۔ ان ڈوبیس بیٹل IN DUBIOUS BATTLE ایک ایسا ہی ناول ہے جس
نے انگریزی کی حدیں توڑ کر یورپ اور یورپ سے باہر کئی زبانوں میں ترجمے کا رتبہ حاصل

کیا، آندرے ژید ANDRE GIDE نے "ان ڈو بیس بٹیل" کو عصر حاضر کی ایک بڑی فکر انگیز اور اعلیٰ تخلیق قرار دیتا ہے۔

" جتنا کہ میں کیپو زم سے واقف ہوں، یہ ناول اس کی بہترین اور مکمل پورٹریٹ ہے۔ یہ سرمایہ داروں اور اس کی حامی بورژوازی کو دھندیں چھوڑ دیتا ہے۔"[۳۰]

آندرے ژید ان ڈو بیس بیٹل کو ایک مخصوص حوالہ دیتا ہے۔ اور اس ناول میں اس حوالے کو متشکل قرار دیتا ہے۔ جان سٹین بک نے TORTILLA FLAT میں کہانی پیش کرنے کے لئے اجتماعی مسائل کی پیش کاری کے لئے جس عضوی سٹرکچرل ڈیزائن کی یا ننت کی تھی۔ ان ڈو بیس بیٹل میں مکمل ہوتی نظر آتی ہے۔ یہاں گریپس آف ریتھ کی نسبت مسائل زمین سے اوپر اٹھ کر زمین پر بسنے والے اجتماع اور خصوصی صنعتی افراد کے گرد حلقہ کرتے ہیں۔ جسے بلاشبہ جان سٹین کی کامیاب پیش قدمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ٹورٹیلا فلیٹ کے بعد جان سٹین بک کا ناشر سے ہلکے پھلکے کتاب کا متقاضی تھا مگر جان سٹین بک کی نظریں کاروباری ذہنیت میں لت پت تباہی سے ہمکنار اس شکست خوردہ شخص پر جمی ہوئی تھیں، جس نے سالینا زکی معاشرت کو غیر متوازن کر رکھا تھا اور اس کا دائرہ زرعی اداروں سے صنعتی علائق تک دراز تھا بقول آندرے ژید:

"(اس ناول کا) مرکزی کردار ایک ہجوم ہے۔ لیکن اس بے صورت اور بے ہنگم ہجوم میں انفرادی چہرے بھی نظر آتے ہیں۔ جن پر مختلف مسائل کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔"[۳۱]

اندرے ژید اس ناول کی مقصدیت کو نہایت معروضی حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تحرک کی بات کرتا ہے جو ناول میں بڑے پیمانے پر مخالفت یا حمایت میں نظر آتی ہے اور جن میں باہمی اشتراک مفادات کی ہم آہنگی

کا ہے۔ کوئی مزدور لیڈر یا عام کردار مصنف کی مقررکردہ حدود سے زیادہ مطالبات کے سیلاب میں اتر نہیں سکتا۔ کیونکہ مطالبات کا جواز، جیسا کہ خود ان مطالبات کی جدوجہد کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ مشکوک DUBIOUS ہے، لیکن جان سٹین بک اس پر قائم ہے کہ جو لوگ جدوجہد کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ بالآخر دغابازی، ناانصافی اور جبریت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس طرح کتنے ہی شرفاء اور عالی ہمت افراد تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہی دکھ میں مبتلا کر دینے والی صورتِ حال خوبصورت اور المیاتی کتاب میں پھیلی ملتی ہے۔

جان سٹین بک نے ۵۰ سال پر پھیلے ہوئے ادبی زندگی کے وسیع منظرنامے میں اپنی پون صدی کے تجربات کو سمونے کی کوشش کی۔ اس نے نہایت مسرت کی زندگی بسر کی اور نہایت عشرت کے دن بھی دیکھے، مگر اس کے فکری فلک الافلاک پر صداقت اظہار ایک لمحے کے لئے بھی اس کے لفظوں سے محو ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس نے ناول لکھے، افسانے تحریر کئے، جنگی نامہ نگاری کی، سفرنامے اور بحری حیاتیات پر زورِ قلم صرف کیا۔ اس کا مقصدی زاویۂ نظر بھرپور سامنے آیا: جان سٹین بک کے نقاد ڈاکٹر پیٹر لزکا کے بقول "اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو سمجھنے کے لئے اس کے شعوری ادراک کو سمجھنا ہوگا۔ ہم اسے "امریکی شعور کا ماہر تسلیم کرکے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں" جو اپنے ہم وطنوں کے لئے انصاف کے حصول (اپنے لوگوں) کی اتنی ہی مدد کرتا ہے، جتنی (ان لوگوں میں) اہلیت ہے۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے آگاہ ہے اور براہ راست اپنے شعور و ادراک اور اپنے تجربات کی مدد سے وہ لوگوں کے دکھوں کی کہانی سناتا ہے۔ یہاں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے اور جہاں کہیں وہ ناکام رہتا ہے اس کے پیچھے کئی وجوہات نظر آتی ہیں" جب وہ حسیاتی ادراک کے کمزور واسطے

اخلاقیات کی جانب رغبت کرتا ہے اور قارئین کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے شعور کی بجائے ضمیر کو آواز دیتا ہے، تو لوگوں کی طرف سے اس کا جواب نہیں ملتا، جیسا کہ اس کے پہلے ناولوں کے ساتھ ہوا۔

جان سٹین بک ایک ایسا فنکار ہے، جس نے کھیت، مزدور، سڑک بنانے والے مزدور، سرپر کنکریٹ کی ٹوکری اٹھا کر نیویارک میں کام کرنے والے مزدور سے لے کر دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام یافتہ شخص تک زندگی کے ایک ایک لمحے کو اپنی روح کی تاروں پر بسر کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیچر اور متھ

1. PETER LISCA

NATURE AND MYTH

THOMAS Y CROWELL COMPANY N.Y P-4 P-6

۲۔ ایضاً ۔ صفحہ ۶

۳۔ کیرول ہیننگ — 3. CARAL HENNING.

۴۔ دی مرڈر نے او ہنسری پرائز حاصل کیا۔ — THE MURDER WITH O'HENRY PRIZE

۵۔ 5. FREEMAN CHAMPOSSLY

JOHN STAN BRANCH CALLIFORNIA

THE AVTEOEH REVIEWS VII SEPT. 47 P-345-62

۶۔ ایضاً

۷ ایضاً

۸۔ بحوالہ جان سیٹن بک

8. CANNERY ROW VIKING PRESS N.Y. 45

۹۔ پیٹر لزکا فیچر اور متھ صفحہ ۲۲ کے مطابق یہ سکرپٹ جان سیٹن بک نے لکھے ۔ جبکہ جان سٹین بک پر مرتبہ مضامین " جان سٹین بک " تدوین رابرٹ مرے ڈیوز صفحہ ۱۷۶ کے مطابق لائف بوٹ کا سکرین پلے الفرڈ ہچکاک نے تحریر کیے۔

۱۰۔ نوبیل پرائز وصول کرتے ہوئے نوبیل لیکچر سے اقتباس۔

۱۱۔ ہنری جیمس دی آرٹ آف فکشن بحوالہ وارن فرینچ

۱۲۔ THE JOURNALS OF ANDRE GIDE 12

VOL IV TRANSLATION JUSTIN O'BRIEN

ALFRED A. KNOPF N.W. 51

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ پینچر اور متھ۔

John Buck

Bibliography

Bombs Away: The Story of a Bomber Team. New York: Viking Press, 1942.
Burning Bright. New York: Viking Press, 1950.
Cannery Row. New York: Viking Press, 1945.
Cup of Gold. New York: Robert M. McBride & Co. 1929.
East of Eden. New York: Viking Press, 1952.
The Forgotten Village. New York: Viking Press, 1941.
The Grapes of Wrath. New York: Viking Press, 1939.
In Dubious Battle. New York: Covici, Friede, 1936.
The Long Valley. New York: Viking Press, 1938.
The Moon Is Down (play).New York: Viking Press, 1942.
Of Mice and Men (separate editions of novel and play). New York: Covici, Friede, 1937.
The Pastures of Heaven. New York: Brewer, Warren & Putnam, 1932.
The Pearl. New York: Viking Press, 1947.
The Red Pony. New York: Covici, Friede, 1937 [contains only three stories].
The Short Reign of Pippin IV. New York: Viking Press, 1957.
Sweet Thursday. New York: Viking Press, 1954.
To a God Unknown. New York: Robert O. Ballou, 1933.
Viva Zapata! (script of 1952 film). New York: Viking Press, 1974.
The Wayward Bus. New York: Viking Press, 1947.
The Winter of Our Discontent. New York: Viking Press, 1961.
America and Americans. New York: Viking Press, 1966.
Un Americain New York et Paris. Paris: Rene Julliard, 1956 (Contains some short fictions; French translation byJean-Francois Rozan; no edition in English)
Journal of a Novel: The "East of Eden" Letters. New York: Viking Press, 1969.
Once There was a War. New York: Viking Press, 1958 (despatches to the New York Herald Tribune in 1943, with a new introduction by the author)
A Russian Journal. New York: Viking Press, 1948.

Sea of Cortez, with Edward F. Ricketts. New York: Viking Press, 1941.
Speech Accepting the Nobel Prize for Literature. New York: Viking Press, 1962. Limited edition of 3200 copies, not for sale.
Their Blood Is Strong. San Francisco: Simnon J. Lubin Society of California, 1938. Newspaper reports to the *San Francisco News* in 1936, with a new conclusion by the author.
Travels with Charley in Search of America. New York: Viking Press, B2

ASTRO, RICHARD. *John Steinbeck and Edward F. Ricketts: The Shaping of a Novelist*. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1973. An analysis of the influence of Rickett's Philosophy on Steinbeck's fiction, drawing extensively upon Ricketts's unpublished philosophic essays. PBURROWS, MICHAEL. *John Steinbeck and His Films*. St. Austeli, Cornwall [England]: Primestyle, 1970. A reprinting of comments from many sources, accompanied by many still photographs from the films.
FONTENROSE, JOSEPH. *John Steinbeck: An Introduction and Interpretation*. New York: Barnes & Noble, 1963. A distinguished Classical scholar's poineering account of the variety of mythological materials reflected in Steimbeck's ficitions.
FRENCH, WARREN. *A Filmguide to "The Grapes of Wrath"*. Bloomington: Indian University Press, 1973. A guide to the study of the film as both an autonomous work of art and an adaptation of the novel.
ASTRO, RICAHRD, and TETSUMARO HAYASHI, eds. *Steinbeck: The man and His Work*, Corvallis: Oregon State University Press, 1971. Collects ten biographical and critical articles on Steinbeck's novels and film scripts aat Oregon State University in 1970.
DAVIS, ROBERT MURRAY. ed. *Steinbeck: A Collection of Critical Essays*. Englewood Cliffs, N.J. Prentice-Hall (Twentieth Century Views series), 1972. Reprints a dozen essays by some of the best-known commentators on Steinbeck's fiction.
DONOHUE, AGNES McNEILL, ed. *A Casebook on "The Grapes of Wrath*. New York: Crowell, 1968. A hefty compendium of pratically all useful criticism of the novel published by the mid-1960s.
FRENCH, WARREN, ed. *A Companion to "The Grapes of Wrath*. New York: Viking Press, 1963. Reprints *Their Blood Is Strong*, Seinbeck's newspaper stories of 1936 about the migrants, along with criticisms of the novel and its historical background.
HAYASHI, TETSUMARO, ed. *Steinbeck's Literary Dimension: A Guide*

to Comparative Studies. Metuchen, N.J. Scarecrow Press, 1973. A collection of eleven essays by various writers comparing Steinbeck with Dickens, Faulkner, Hemingway, Kazantzakis, D.H. Lawrence, Daniel Mainwaring Milton, J.L. Salinger, Adlai Stevenson, R.P. Warren, and Emile Zola, accompanied by reviews of scholarship by Peter Lisca and the editor. ed. *A Study Guide to Steinbeck: A Handbook to His Major Works*. Metuchen, N.J. Scarecrow Press, 1974: Original critical discussion of Steinbeck's major fictional and nonfictional works, each by a different author, with suggestions for their use in the classroom.

LISCA PETER, ed. "*The Grapes of Wrath. Text and Criticism*. New York: Viking Press. 1972. This resetting of the text of the novel is accompanied by some hitherto unpublished Steinbeck letters and a variety of criticisms of the novel.

Steinbeck Quarterly. Muncie, Ind: John Steinbeck Society of America and Ball State University. Begun as *Steinbeck Newsletter* in 1968, but printed under present name since first issue of Volume Two in 1969. Edited by Testsumaro Hayashi, the journal is a repository of articles, reviews, and short biographical and bibliographical notes about Steinbeck. Especially useful are the Summer, 1971 (IV,iii) Special Conference Number, which collects papers delivered at the Steinbeck Conference in San Jose, California, in 1971; and the Summer-Fall, 1972 (V,iii-iv) and Winter, 1973 (VI,i) issues, which constitute an authority by established scholars and younger critics of separate criticisms of the short stories in *The Long Valley*.

TEDLOCK, ERNEST W. JR. and C.V. Wicker, eds. *Steinbeck and His Critics: A Record of Twenty-Five Years*. Albuguerque: University of New Mexico Press, 1957. This first compilation of writings about Steinbeck reprints many of the essays of continuing value from the 1930s and 1940s, along with Peter Lisca's survey of the scholarship predating the publication of his *The Wide World of John Steinbeck* (1958).

3. Film

United States Information Agency. *An Impression of John Steinbeck—writer*, 1970. A 22-minute, color film, produced and directed by Donald Wrye and narrated by Peter Haskell, with Henry Fonda as the voice of John Steinbeck. The producer-distributor, the United States Information

Agency, which prepares films about Americal life for circulation abroad, describes this film in an official release as "A series of vigettes of the life and writings of the late John Steinbeck — one of best-known contemporary American authors. It includes recollections by persons who knew Steinbeck at different times during his life, and some of his own comments about himself. "Writers in Christian Perspectives," this pamphlet discusses Steinbeck's use of Christian elements in "syncretic allegories."

WATT. F.W. *John Steinbeck*, Edinburgh and London: Oliver and Boyd; New York: Grove Press, 1962. This thin but sophisticated introduction of Steinbeck to European readers discusses his "regionalism" and the effect of "Non teleological thinking" on his fiction.

John Steinbeck. New York: Twayne Publisher, 1961. This first edition of the present book presents material on non-teleological thinking and Steinbeck's relationship to American transcendentalism omitted from this book.

GARCIA, RELOY. *Steinbeck and D.H. Lawrence: Fictive Voices and the Ethical Imperative*. Steinbeck Monograph of America, 1972: A demonstration of strikingly similar strengths and weaknesses in the fictions of the two writers.

GRAY, JAMES. *John Steinbeck*, University of Minnesota Pamphlets on American Writers Number 94. Minneapolish: University of Minnesota Press, 1971. A short tribute to Steinbeck's story-telling skill, which describes him as "a moral ecologist, obsessively concerned with man's spiritual struggle to adjust to his environment."

JONES. LAWRENCE WILLIAM. *John Steinbeck As Fabulist*. Steinbeck Monograph Series Number Three, edited by Marston LaFrance, Muncie, Ind: John Steinbeck Society of American, 1973. A discussion of Steinbeck's propensity for parable-writing, especially after World War II. utilizing the techniques for classifying fiction explained in Sheldon Sack's *Fiction and the Shape of Belief*.

LEVANT, HOWARD. *The Novels of John Steinbeck*. Columbia: University of Missouri Press, 1974. A study of Steinbeck's fiction in terms of his use of "dramatic" and "panaromic" techniques, especially as these relate to his increasing problems in finding adequate forms to embody fictionally his philosophy.

LISCA, PETER. *The Wide World of John Steinbeck*. New Brunswick, N.J: Rutgers University Press, 1958. Although in need of updating, this

book remains the most through and detailed study of Steinbeck's fiction, uniquely valuable for the reproduction of correspondence between Steinbeck and his agents and publishers.

MARKS, LESTER JAY. *Thematic Deisng in the Novels of John Steinbeck.* The Haque and Paris, New York: Mouton, 1969. An examination of the aesthetic resolution in the novels of three recurring patternsman's need of a god, man viewed as a "group animal," and the "nontheleological" concept that the "very mystery of life" sprus the search for human values.

MOORE, HARRY THORNTON. *The Novels of John Steinbeck: A First Critical Study.* Chicago: Normandie House, 1939: Port Washington, N.Y.: Kennikat Press, 1968. Written shortly after *The Grapes of Wrath*, this poineering study provies insights into the critical attitudes of the 1930s.

PRATT, JOHN CLARK. *John Steinbeck: A Critical Essay.* Grand Rapids, Mich: Eerdmants, 1970. Part of a series on "Contemporary"

زندگی کے سٹیج پر المیہ کردار

یوجین اونیل

امریکی ڈرامے کی تاریخ میں انقلاب برپا کرنے والا یوجین گلیڈ سٹون اونیل اپنی زندگی کے سٹیج پر تمام عمر ایک المیہ کردار ادا کرتا رہا۔ یہ المیہ اور روح کی ناآسودگی اسے ورثے میں ملی تھی اور وہ اسے تمام عمر قسطوں میں اپنے ڈرامے میں انڈیلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا ماحول، فضا، کردار، اس کا گھر، اس کے ماں باپ، بھائی اور خود اس کی ذات اس کے ڈراموں کے گرد گھرے نظر آتے ہیں۔ ڈرامے کے تمام نقاد اور اس کے تمام مداح اس بات پر متفق ہیں کہ ڈراموں کے روپ میں یوجین اونیل نے اپنی آپ بیتی کو ہنرکاری کے ساتھ اس طرح پیش کیا، کہ نہ صرف اس کے ڈرامے اس کی ذات سے اوپر اٹھتے ہوئے معاشرتی رویوں کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں، بلکہ فنی لحاظ سے امریکی ڈرامے کے لئے جہانِ تازہ آباد کرتے نظر آتے ہیں اور آج یوجین اونیل ایک ایسا نام ہے جس کی موت پر اخبارات اور رسائل نے بلاشبہ یہ اعتراف کیا کہ یوجین اونیل نے امریکی ڈرامے کو بہت چھوٹا اور کمزور کر دیا ہے۔

یوجین گلیڈ سٹون اونیل EUGENE GLADSTONE O'NEIL آئرش امریکی تھا۔ اس کے دادا آئرلینڈ سے خوشحالی کی تلاش میں امریکہ پہنچے تھے، مگر نستعلیا

کا کرب اور دکھ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوجین کا والد جیمس اونیل JAMES O'NEIL جب بڑا ہوا تو وہ خواب جو اس کے والدنے دیکھے تھے، اس کے گرد ملفوف کرنے لگے۔ وہ ان خوابوں کی تعبیر کے لئے میدانِ عمل میں نکلا اور بندرگاہ پر محنت مزدوری کرنے لگا۔ ان ہی دنوں اس علاقے میں ایک تھیٹر آیا جو شہر شہر گھوم کر کھیل پیش کرتا تھا۔ اتفاق سے ان کا ایک آدمی جو معمولی کردار پیش کرتا تھا، بیمار ہوگیا۔ انہیں ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو اس کا کردار ادا کر سکے۔ جیمس وہیں موجود تھا، اس نے اپنا نام پیش کر دیا اور اس طرح محنت مزدوری کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے سٹیج کی دنیا میں آگیا۔ اسے چھوٹے بڑے کردار ملنے لگے اور وہ تھیٹر کے ساتھ شہر شہر گھومنے لگا۔ اسی دوران اس کی قسمت نے یاوری کی۔ اس کے تھیٹر میں ایک ڈرامہ دی کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو THE COUNT MONTECRISTO پیش کیا گیا۔ جس میں اسے ہیرو کے طور پر پیش ہونے کا موقع ملا اور یہیں سے اس کا فنی اور معاشی عروج شروع ہوا۔ اس نے اس کردار کو مسلسل ۳۰ سال تک ادا کیا اور ۲۵ سال میں چھ ہزار سے زاید مرتبہ وہ اس کردار میں سامنے آیا۔

اس کا تھیٹر کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا تھا جس کے نتیجے میں اسے شہروں شہروں گھومنا پڑتا۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک خاتون ایلن ELLON سے ہوئی، جسے عام طور ایلا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، اور وہ موسیقی کی دلدادہ تھی۔ جلدی اس نے جیمس سے شادی کرلی۔ دونوں میں بے حد محبت تھی۔ یہی محبت آغاز سے ہی ایک دوسرے کے لئے عذاب بن گیا۔ جیمس ایک طرف تو کسی بھی شہر میں مستقل ٹھہر نہیں سکتا تھا اور دوسری طرف وہ ایلا کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جس کے سبب ایلا کو بھی اس کے ساتھ شہر شہر دھکے کھانے پڑتے تھے۔ ایلا

پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھی جب کہ تھیٹر میں ہر قسم کا شخص موجود تھا۔ ان پڑھ اور جاہل لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھیٹر کے گرد جمع تھی۔ ایلین ان لوگوں میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر جیمس نے اسے نیویارک میں ایک مکان خرید دیا۔ لیکن ایلین کو وہاں بھی ٹک کر رہنا نصیب نہ ہوا۔ اسی دوران اس کا پہلا بیٹا جان اونیل JOHN O'NEIL پیدا ہوا۔ ایلین کا خیال تھا کہ ان کے ہاں اولاد نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اپنی خود ساختہ خانہ بدوشی کے سبب وہ اولاد سے انصاف نہ کر سکیں گے۔ مگر جیمس اولاد کا خواہش مند تھا۔ اسی دوران اس کے ہاں دوسرا بیٹا جیک اونیل بھی پیدا ہو گیا۔ اب ایلین مزاحمت پر اُتر آئی تھی، مگر اس کی مرضی کے خلاف اس کے ہاں تیسرا بیٹا ۱۶ ار اکتوبر ۱۸۸۸ء کو نیویارک میں پیدا ہوا، جس کا نام یوجین گلیڈسٹون اونیل رکھا گیا۔ مگر ابتدا سے ایک المناک خیال بھی اس کے ساتھ پروان چڑھتا رہا کہ وہ ایک ناپسندیدہ UNWANTED CHILD ہے اور یہ خیال ساری زندگی اس کے ذہن میں موجود رہا۔ جن دنوں اس کی پیدائش ہوئی، جیمس کسی دوسرے شہر میں تھا اور بڑی مشکل سے ۵ یوم کی رخصت لے کر گھر آیا تھا۔ یوجین کی پیدائش پر ایلین شدید بیمار ہوئی اور اس کی تکلیف کی شدت کم کرنے کے لئے ڈاکٹر نے مارفیا کے انجکشن لگائے۔ تکلیف طویل ہوتی گئی۔ مارفیا کی مقدار بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایلین نشے کی عادی ہو گئی۔ یہ المیہ بھی اس کی زندگی کے دوسرے بڑے المیے کے طور پر ہمیشہ یوجین کے ذہن میں پلتا رہا۔ وہ بڑا ہو کر ہمیشہ اپنے باپ کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا رہا کہ اس نے ماں کا علاج ایک گھٹیا ڈاکٹر سے کرایا، جس نے اس کی ماں کو ساری زندگی کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ وہ ڈاکٹروں کے بھی سخت خلاف تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے اور پیسہ بٹورنے کے لئے معصوم لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں، سکھ نہیں۔

نشے کی عادی ہونے کے بعد اسے سینی ٹوریم ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، جہاں اس نے نشہ ترک کر دیا، مگر ہسپتال سے گھر آنے کے بعد دوبارہ نشے کی لت میں مبتلا ہو گئی۔ اسی طرح وہ کئی بار ہسپتال میں داخل ہوئی اور ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ نشہ شروع کر دیتی۔ اصلاً اس کے گھریلو حالات میں عدم توازن سے وہ بار بار ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

یوجین ذرا بڑا ہوا تو سارا دن ہوٹل کے کمرے میں ماں کے ساتھ رہتا اور شام کو باپ کے ساتھ تھیٹر چلا جاتا، جہاں پردے کے پیچھے اپنے باپ کو میک اپ کرتے دیکھتا، کبھی پردے کے سامنے جانے کی نوبت نہ آئی۔ یہاں سے یوجین کی زندگی کا تیسرا بڑا المیہ آغاز پاتا ہے جس نے اسے تمام عمر احساسِ کمتری میں مبتلا رکھا۔ جس عمر میں اسے بچوں کے ساتھ کھیلنے، گھر کے ماحول اور ماں باپ کی شفقت کے مستحکم رشتوں کی ضرورت تھی، اس عمر میں وہ دن ہوٹل کے کمروں میں اور شامیں تھیٹر کے پیچھے گزارتا رہا تھا۔ اس صورتِ حال نے اس میں نفسیاتی پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ اس کا احساسِ تنہائی اور شرمیلا پن تمام عمر اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اسی عرصہ میں اس کے ساتھ ایک اور المیہ پیش آیا۔ اس کا بڑا بھائی چیچک کا شکار ہو گیا، اس کی بیماری ٹھیک ہوئی تو منجھلا بھائی جیک چیچک میں مبتلا ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔ ان دنوں اس کے ماں باپ گھر میں نہ تھے۔ چنانچہ بھائی کی موت کا صدمہ اسے ہمیشہ پریشان کئے رہا اور اس کی ذمہ داری اپنے باپ پر ڈالتا رہا۔

۱۸۹۵ء میں یوجین کو سینٹ ولکنٹ کیتھولک بورڈنگ سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اب وہ چیزوں کو اپنے اردگرد محسوس کرنے لگا تھا۔ گھر کے ماحول، ماں کی بیماری اور باپ کی آوارہ خرامی نے اس کے ذہن پر شدید منفی اثرات ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ وہ گھر کی خرابی کو باپ کی لاپروائی سے تعبیر کرتا تھا۔ اسے ماں کی نشہ آوری نے شدید

مجروح کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ اکثر راتوں میں جاگ کر خدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگتا کہ اے خدا تو میری ماں کو صحت دے۔ اسے نشے کی عادت چھڑا۔ میں تیرے لئے ایک مضبوط کیتھولک بندہ بن کر ساری زندگی تیری راہ میں صَرف کروں گا۔ بار بار کی دُعاؤں کی بے اثری نے اس کے مذہبی حوالوں پر ضربیں لگانا شروع کیں اور اس کا اعتقاد کمزور پڑنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے مذہب اور مذہبی روایات دونوں سے دور ہوتا ہوا بالآخر اُس منزل تک پہنچا کر اس نے کُلی طور پر مذہب سے قطعی انحراف اختیار کیا۔ ایک مکمل لادین بن کر خدا کا باغی بن گیا۔

۱۹۰۶ء میں سکول سے گریجوائشن کرنے کے بعد پرنسٹن یونیورسٹی PRENCTON UNIVERSITY میں داخل ہو گیا۔ (بعض سوانح خاکوں میں YALE یونیورسٹی کا نام بھی لیا گیا) مگر وہ ایک سال سے زیادہ پرنسٹن میں نہ ٹھہر سکا۔ اب وہ اپنے بڑے بھائی جمی کی صحبت میں شراب نوشی کی لت میں پڑ چکا تھا۔

اس کا باپ جو اب ایک مالدار آدمی تھا، دوستوں پر بے تحاشا خرچ کرتا مگر گھر اور بچوں کے معاملے میں سخت کنجوس تھا۔ جان اور یوجین دونوں پیسوں کے ہاتھوں تنگ رہتے۔

۱۹۰۹ء میں یوجین کی ملاقات کھاتے پیتے گھرانے کی ایک خوبصورت لڑکی کیتھلین جنکس KATHLEN JINKIN سے ہوئی جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں سامنے آیا، لیکن وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہ سکے اور ایک بچے کی پیدائش کے بعد دوبارہ کبھی نہ ملے۔

اسی دوران (۱۹۱۰ء) اس کے باپ نے کیتھلین کے ساتھ اس کا ملنا جلنا پسند نہ کیا۔ یوجین ایک شرمیلا نروس نوجوان تھا اور باپ کے زیرِ دست بھی۔ شادی کے بارے

میں اب تک اس نے کچھ نہ بتایا۔ باپ نے اس سے کہا کہ اگر وہ کھتیلین سے شادی نہ کرے تو وہ اسے کاروبار میں لاسکتا ہے اور اس کے لئے اسے HONDRUS بھیجنے کی کوشش کی جہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں سونے کی کانیں ہیں۔ جمیس نے یوجین سے کہا کہ وہ وہاں جائے اور زمین خرید کر سونے کی تلاش کرے۔ گھر سے کاروبار کی غرض سے نکلنے والا یوجین ایک سال تک سمندر کے سینے پر بادبانی جہاز پہ اونچی نیچی لہروں سے زندگی کا تدزز حاصل کرتا رہا۔ غالباً امریکی ساحلوں پر سفر کرنے والا یہ آخری بادبانی جہاز تھا۔ ایک سال بعد وہ قلاش ہو کر گھر پہنچا۔ مگر پھر جلد ہی دوبارہ سمندری ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور ایک دخانی جہاز پر سیلر بھرتی ہو گیا جو امریکہ کی مختلف بندرگاہوں پر بار برداری کا کام کرتا تھا۔ اس جہاز پہ بیونس آئرس تک گیا۔ اس جہاز سے واپسی پہ وہ گھر نہیں لوٹا، بلکہ ایک تیسرے سفر پر سمندر پر تیرنے لگا۔ اب اس کا سفر سٹیم شپ پہ تھا، یوں مسلسل غیر متوازن خوراک، بے آرامی اور شراب نوشی نے اس کی صحت خراب کر دی۔

۱۹۱۲ء میں کیتھلین اور اس کے تعلقات کا اختتام طلاق پہ ہوا۔ اسی سال وہ چھ ماہ تک ٹیلیگراف جریدے میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اسی دوران اسے تپ دق کا عارضہ ہو گیا۔ باپ نے پہلے تو ایک سستے سے ڈاکٹر کے زیرِ علاج رکھا، مگر جب جمیس اونیل کے دوستوں نے لعن طعن کی تو اسے سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا گیا۔ سینی ٹوریم میں داخلہ اس کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اسے بچپن سے لکھنے کا شوق تھا۔ پہلے پہل وہ شاعری کی طرف راغب ہوا۔ اس کے پسندیدہ شعراء میں لارڈ بائرن اس کا آئیڈیل تھا مگر ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس کی توجہ فطری اور موروثی تھی۔ چنانچہ سینی ٹوریم کے قیام کے دوران اس نے ڈرامہ لکھنے کی کوشش کی اور پھر چھوٹے بڑے ڈرامے لکھتا ہی چلا گیا۔ اس کا پہلا ڈرامہ A WIFE FOR LIFE اور دوسرا

تھا۔ پہلا ڈرامہ THE WEB شائع ہوا مگر کھیلا نہ جا سکا۔ وہ چھ ماہ ہسپتال میں رہا مگر اس چھ ماہ میں اس نے لکھنے کی راہ پالی تھی۔

گھر آنے کے بعد اس کے باپ نے یوجین کے یک منظری ڈرامے پڑھے اور اسے ۱۹۱۴ء میں شائع بھی کیا مگر یہ زیادہ داد حاصل نہ کر سکے۔ اسی سال وہ ڈرامے کی تربیت حاصل کرنے ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا، جہاں اسے ڈاکٹر جارج پیرس بیکر سے ڈرامے کی تکنیک اور پیش کش کا طریق کار سیکھا اور عملی تربیت کے لئے مشہور "ستاون ویں ورکشاپ" میں شرکت کی اور ۱۹۱۵ء کے اواخر میں نیو یارک واپس آ گیا۔ اب باپ کے ساتھ اس کی ایک خاموش جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ گھر کی بے ترتیبی، ماں کی بیماری اور اپنی غیر متوازن زندگی کا ذمہ دار اپنے باپ کو ٹھہراتا تھا۔ چنانچہ اس کے اندر باپ کے لئے ایک نامعلوم نفرت پل رہی تھی۔ ایک بار اس کا باپ اسے اپنے ساتھ تھیٹر لے جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر کے باہر یوجین کا انتظار کر رہا تھا مگر یوجین جانے پر آمادہ نہ تھا۔ باپ نے زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ یوجین نے مزاحمت کی۔ دونوں میں زور آزمائی ہوئی مگر باپ اسے ساتھ نہ لے جا سکا۔ یہاں دونوں کے دلوں میں نفرت کی ایک نئی لہر ابھرتے نظر آتی ہے۔

۱۹۲۶ء اس کی زندگی کا ایک اہم سال ثابت ہوا جب وہ پروونس ٹاؤن PROVENCE TOWN آ گیا جہاں وہ ایسے لوگوں کی صحبت میں ایک ہوٹل تک رسائی حاصل کر گیا جو معاشرے کی استحصالی قدروں سے بے زار نوجوانوں کا گڑھ تھا۔ ادیب، شاعر، مصوّر، ڈرامہ نگار، اداکار تمام فرسٹیٹڈ نوجوان یہاں آتے اور جوشیلے جذباتی مگر پرخلوص انداز میں معاشرے کے جابرانہ رویّے کے خلاف بھڑاس نکالتے۔ نیستی پسندوں NIHLISTS کا یہ گروہ ایک دوسرے کا دوست اور ہمدرد تھا۔

یہیں اس کی ملاقات ایک نوجوان COOK سے ہوئی، جس نے اس کی ملاقات
نوجوان ڈرامہ نگاروں اور اداکاروں سے کرائی اور اسے پروونس ٹاؤن PROVENCE
TOWN کے ایک قابلِ ذکر ڈرامہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا اور یوں یوجین
نوجوانوں کے اس گروہ کا رکن بن گیا۔ یوجین کو اپنے باپ کا روایتی تھیٹر پسند نہیں تھا،
مگر ایک بات اس کے ذہن میں واضح تھی کہ لوگ تھیٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ
انہیں روایتی تھیٹر سے نکال کر ان کے سامنے جدید معاشرتی مسائل کے حوالے سے ڈرامے
پیش کئے جائیں۔ یہ خیال اس کے دوسرے ساتھیوں کو پسند آیا۔ اس وقت یورپ میں برطانیہ،
سویڈن، فرانس اور دیگر ممالک میں برنارڈ شا، البسن، سٹن برگ اپنے اپنے ڈرامے
کی شناخت تھے۔ ان نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ امریکی آرٹس تھیٹر کی بنیاد رکھی جائے۔
اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے امریکی تھیٹر کا آغاز کیا۔ تھیٹر کی جگہ کے
لئے انہوں نے جس مقام کا انتخاب کیا وہ کبھی سمندری سامان کے ذخیرہ کرنے کی جگہ تھی۔
پشت پر سمندر تھا اور سامنے خاصی کھلی جگہ موجود تھی۔ اس جگہ کی بربادی کا یہ عالم
تھا کہ اسے "جہنمی درہ" HELL HOLE کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بہرحال پرنس ٹاؤن تھیٹر کی بنیاد
رکھ دی گئی۔ لوگوں سے چندہ لے کر تھیٹر کا آغاز ہوا۔ ڈرامہ نگار، اداکار اور دوسرے
کارندوں نے رضاکارانہ طور پر کام کرنے کا تہیہ کیا۔ سٹیج کو کشتی کی شکل میں بنایا گیا۔ پس منظر
میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا اور نومبر ۱۹۱۶ء میں یوجین کا پہلا ڈرامہ
BOUND EAST FOR CARDIFF پیش کر دیا گیا اور پھر دوسرا تھرسیٹ
THURIST دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ایک جم غفیر ان کے تھیٹر کو گھیرنے لگا
اور یوں یوجین نے اپنی زندگی کا شاندار آغاز کیا۔ ان ڈراموں میں نہ روایتی انجام ہوتا تھا
نہ آغاز۔ بلکہ شدید جذباتی انداز میں اس کے ڈرامے لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے تھے۔

اب صورت یہ تھی کہ لوگ پروونس ٹاؤن تھیٹر کے لئے یوجین کو جزو لاینفک سمجھتے تھے،
مگر یوجین کا خیال تھا کہ اگر یہ تھیٹر نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنے فن کا مظاہرہ نہ کر سکتا۔

اب انہوں نے ساحل سے اپنے تھیٹر کو نیویارک شہر میں لے جانے کا پروگرام بنایا اور
تھیٹر کو براڈوے میں منتقل کر دیا اور اس نے جب یہاں پہلی بار اپنا پہلا ڈرامہ پیش کیا
تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کا تھیٹر اور اس کے کھیل عروج کی انتہا کو چھونے لگے۔ یہیں اس کی
ملاقات اجنبیس بولٹن سے ہوئی جو ایک اخبار نویس اور سوشل خاتون تھیں اور ۱۹۱۸ء میں
دونوں نے شادی کر لی، جس میں سے اس کا بیٹا شان اونیل ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوا۔

اس نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک بیس ڈرامے پیش کئے سو سب کے سب لوگوں
میں مقبول ہوئے۔ اب اس نے امریکی تھیٹر کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی جہت دینے کا
فیصلہ کیا۔ اب تک وہ یک منظر ڈرامے پیش کرتا رہا تھا، مگر اب اس نے طویل ڈرامے لکھنے کا
فیصلہ کیا اور معرکۃ الآرا ڈرامہ افق سے پار BEYOND THE HORIZON جو طویل
دورانیے کا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں پیش کر دیا۔ یہ ڈرامہ اس نے موراسکو MOROSCO
تھیٹر سے پیش کیا جو حال ہی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے کے پیش کرتے ہی وہ یک دم امریکہ
کے بڑے ڈرامہ نگاروں میں شامل ہو گیا اور اس ڈرامے پر اسے پلٹزر PULTIZER ایوارڈ
ملا۔ اب وہ شہرت کی بلندیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم
تھا مگر وہ ان سب میں اکیلا تھا۔ اس کے اندر مچلتے ہوئے المیوں اور تنہائیوں نے اسے
ساری دنیا میں اجنبی بنا دیا تھا۔ اس کا شرمیلا پن اور نروس ہونے کے احساسات نے اس میں
بھیڑ سے الجھن کے میلان کو ابھارا۔ چنانچہ جب اسے زندگی میں پہلی بار پلٹزر انعام ملا
تو اس نے اس خوف سے کہ کہیں اسے تقریر نہ کرنی پڑے، اس نے وہاں جانے سے انکار
کر دیا اور جب اسے یقین دلایا گیا کہ کوئی تقریر نہ کرنی پڑے گی وہ ایک ہزار ڈالر کا

پہلا انعام حاصل کرنے کی تقریب میں شامل ہوا۔

" افق کے پار" تحفظ اور ایڈونچر کے تضاد کا ڈرامہ ہے اور یوجین نے دو نظری منطقوں کو دو بھائیوں کے فطری میلان اور عملی تضاد سے واضح کیا ہے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہے، اس کا ذہن وسیع اور نظر میں افق کو چیرتی دور تک جا رہی ہیں جبکہ دوسرا اپنے کھیتوں میں بنے اپنے گھر کے اندر بیٹھا ہے۔ پہلا رابرٹ ہے جو ہمیشہ افق کے پار حسن دخیر کی تلاش میں خواب دیکھتا ہے۔ جبکہ انڈریو عملی آدمی ہے وہ خوابوں کی بجائے حقیقت پر یقین رکھتا ہے۔ دونوں ایک لڑکی روتھ RUTH سے محبت کرتے ہیں، لیکن ایک مرحلے پر مفاہمت کے نتیجے میں رابرٹ روتھ سے شادی کر لیتا ہے۔ مجموعی طور پر افق کے پار رابرٹ، انڈریو اور روتھ تینوں کے المناک انجام کی کہانی بنتی ہے۔ جس کو یوجین نے نہایت ہنرکاری اور چابکدستی کے ساتھ جذباتی اور احساساتی سطح پر پیش کر کے قاری کے فکری رابطوں کو انگیخت کیا ہے۔ یوجین کی نظر رابرٹ کی تلاشِ حسن پر ہے اور وہ اس پر زور بھی دیتا ہے۔ پہلے منظر کے بعد دوسرے منظر میں وہ مادی دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ جب کہ آخری منظر میں اس کا یہ دعویٰ کہ اس کے کردار تمام دکھوں اور عذابوں سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو اصل ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اس کے نکتۂ نظر کو لرزیدہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ یوجین نے جس طرح اسے المیہ بنانے کی کوشش کی ہے وہ رابرٹ کے زاویۂ فکر آزادی یا موت کے فلسفے سے نہیں ابھرتا، یہ تو اصلاً روتھ کے اعتراف شکست سے پیدا ہوتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جب اس کے والد جیمس اونیل کا انتقال ہوا تو اس خبر سے اس نے اپنے اندر ایک عجیب احساس کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر مزاحمت اور شکست در یخت کا جو عمل برسوں سے جاری تھا، دم توڑ گیا۔ وہ باپ کی

موت سے خوش نہیں تھا مگر اب وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں کی صحت بھی بہتر ہونے لگی اور جلد ہی اس نے خاوند کے کاروبار اور جائیداد کی دیکھ بھال کا کام سنبھال لیا۔ یوجین خوش تھا کہ اس کی ماں معمول کی زندگی میں لوٹ آئی ہے۔

۱۹۲۰ء میں اس کا ایک اور ڈرامہ دی ایمپرر جانس THE EMPEROR JONES پیش ہوا جسے اس کے اعلیٰ ترین ڈراموں میں اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ایک حبشی (نیگرو) کی کہانی ہے جو قبائلی علاقے میں جاتا ہے اور سازش کے ذریعے وہاں کا حکمران بن جاتا ہے اور مختلف حیلے بہانوں سے مقامی لوگوں سے دولت سمیٹتا ہے، اس سے قبل کہ وہاں کے لوگ اس کے خلاف بغاوت کردیں، وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے مگر جنگل میں راستہ بھول کر وہیں واپس آجاتا ہے جہاں موت کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے، لوگ اسے گولی مار کر ہلاک کردیتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی کہانی ہے مگر کہانی کے اندر ایک پیچیدہ ماضی چھپا نظر آتا ہے جو خود یوجین کا ماضی بھی ہوسکتا ہے مثلاً نیگرو دیوں تو اصل جنگل میں دوڑتا ہے مگر اس جنگل کی ایک صورت وہ علامتی جنگل کی بھی ہے جو یوجین کے ذہن میں پھیلا ہوا ہے اور اجتماعی لاشعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طرح مگر مچھ کی ہلاکت، ان برائیوں کی ہلاکت کی علامت ہے جو اس کے اندر بستی ہیں اور اس طرح وہ اپنا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انسانی نفس کی تعبیر بھی۔

کہانی کے عفریت بھی علامتی سطح پر اس کی اپنی زندگی کے ان عفریتوں کے مصنوعی علامت ہیں جو تمام زندگی اس کے ساتھ ساتھ جوان ہوتے رہے تھے۔ ان عفریتوں کی موت بیک وقت اس کے ذہنی پیچیدہ عفریتوں کی موت بھی ہے اور خود اس کی اپنی موت بھی۔ جو اس کہانی کو غایت سراب اور خواب کا ڈراما بنا کر شعوری آرزومندی کی سطح سے ابھارتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے انسان کی کہانی ہے، جو نیک و بد کی وحشیانہ آویزش کا شعور کا اور

لاشعوری ہر دو سطحوں پر نشانہ بنتا ہے۔ یوجین اس کہانی کو اس لئے کمالِ فن کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہوا کہ کہانی اور جزئیات پر اس کی گرفت غیر معمولی ہے، کہ وہ انسان جو جنگل میں راستہ بھول گیا ہے وہ خود یوجین ہے۔ اس ڈرامے کو بلاشبہ امریکی تجرباتی دور کے ڈراموں میں اعلیٰ ترین مقام دیا جا سکتا ہے۔ یہ پیشکش، اسلوب، زبان اور موضوع کے اعتبار سے شاندار ہنرکاری کا حامل ہے۔

۱۹۲۱ء میں اس نے ایک اور بڑا ڈرامہ اینا کرسٹی ANNA CHRISTIE پیش کیا جس پر اسے دوسری بار پلٹزر ایوارڈ ملا۔ اسی سال وہ ایک اور ڈرامے ہیری ایپ HARRY APE پر کام کرتا نظر آتا ہے، جسے اس نے ۱۹۲۲ء میں پیش کیا۔ ان ہی دنوں اس کے بھائی نے اسے یہ خبر دی کہ ماں سخت بیمار ہے مگر جلد ہی بیماری کی خبر موت کی خبر میں بدل گئی۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا بھائی بھی شراب نوشی میں کثرت کے سبب انتقال کر گیا۔ ماں اور بھائی کی موت نے اس پر شدید منفی اثرات مرتب کئے۔ دوسری طرف وہ خود اپنے گھر میں ایک بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کی تنہائی پسند عادات کے خلاف بھرپور اور پُرہنگام زندگی گزارنے کی متمنی تھی۔ وہ پڑھی لکھی اور سوشل خاتون تھی۔ اجنبیں تقاریب میں شریک ہوتی۔ اپنے گھر میں تقاریب برپا کرتی۔ اس کے دوست آتے اور یہ سب کچھ یوجین کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ چاہتا کہ اجنبیں شام اس کے ساتھ گزارے، وہ کسی تقریب میں چلی جاتی۔ اس کی خواہش ہوتی کہ گھر میں سکون رہے، اجنبیں دوستوں کو گھر بلا لیتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کا سکون برباد کرنے لگیں۔ اس کی تنہائی اور اجنبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی اپنے کسی ڈرامے کے افتتاحی شو میں بھی شریک نہیں ہوتا تھا۔ پریس کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا، بھیڑ سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ بیوی کی سماجی سرگرمیاں اس کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھیں۔ شاید اس کی ادبی اور تھیٹر کی زندگی

میں ایک موقع ایسا آیا جب اس نے اپنے کسی ڈرامے کے افتتاحی شو میں شرکت کی اور ڈرامہ ہیری ایپ تھا۔ اس نے اس شو کے لئے اپنے تمام دوستوں کو بلایا۔ یہاں تک کہ وہ اس موقع پر ان دوستوں کو بھی نہیں بھولا۔ جن کے ساتھ وہ محنت مزدوری کر رہا تھا۔ اس نے یہ ڈرامہ سب کے ساتھ دیکھا۔

یہ ڈراما اصل میں فطرت، مشین اور مادیت پسندی کے خلاف ردِعمل کہا جا سکتا ہے۔ جو بالآخر مشین کی فتح سے عبارت ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ ہیرو کی جذباتی وابستگی کو جدید معاشرتی اقدار کی وابستگی سے منسلک کرکے ترتیب دیتا ہے۔ اس کا آغاز ہیرو کی غیر معمولی طاقت کے اعلان پر ہوتا ہے اور سیلر کی حیثیت سے گزرے اپنے اچھے دنوں کا خواب دیکھتا ہے۔ مگر جب سفید فام خاتون اسے غلیظ وحشی کا خطاب دیتی ہے تو وہ صدمے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا نیویارک تک پیچھا کرتا ہے مگر نیویارک کے لوگ اسے غیر معمولی انسان سمجھ کر اسے پھر توجہ نہیں دیتے۔ وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ جیل پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ انقلاب کی خبر سنتا ہے مگر ناکامی کی خبر اسے افسردہ کر دیتی ہے۔ یہ افسردگی اسے فریسٹریشن اور فریسٹریشن اس میں غضب اور غصے میں مبتلا کر دیتی ہے اور بالآخر وہ چڑیا گھر میں طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے بن مانس سے مقابلہ کرتا ہے جس کے بعد اس کی ساری زندگی پنجرے میں گزارنے کا سبب بنتی اور موت سے ہم آہنگ ہونے تک ساتھ چلتی ہے۔

۱۹۲۴ء میں ایک اور بڑا ڈرامہ ALL GOD'S CHILDREN GOT WINGS سٹیج کیا۔ اسی سال DESIGNED UNDER THE ELM کھیلا گیا۔

۲۵ء میں اجینس کے ہاں ایک بیٹی اونا OONA پیدا ہوئی اور اسی سال اس کا کھیل THE FOUNDATION کھیلا گیا۔

ایک طرف تو ڈرامے کی دنیا میں نہ ختم ہونے والی کامیابیاں سمیٹ رہا تھا اور دوسری طرف اس کے اندر کا اجنبی اسے ایک مسلسل اضطراب اور بے چینی میں اضافہ کی صورت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا پہلا بیٹا یوجین اونیل جونیئر، اب خود بھی ایک ادیب تھا، اس سے رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ یوجین کو یاد تھا کہ جب وہ ماں کی میت پر پہنچا، تو وہ اور اس کا بھائی دونوں شراب میں دُھت تھے اور جمی اپنے دوستوں اور مسز ریڈ کے ساتھ بدستور شراب نوشی میں مصروف تھا اور بڑی مشکل سے ماں کی آخری رسومات ادا ہوئی تھیں۔ ماضی اس کے لئے ایک عفریت تھا جو اس کی نفسیات کا حصّہ بن گیا تھا۔ یوجین جونیئر کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہ تھا۔ اس دوران وہ خود بھی اپنی اولاد سے وہی سلوک کر رہا تھا، جو اس کے باپ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ کبھی کبھی اسے اس کا خیال ہوتا تھا مگر وہ اولاد سے قریبی ربط پیدا نہ کر سکا

۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک اس نے کئی ڈرامے تخلیق کئے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں YALE نے اسے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۲۸ء میں اس نے ایک اور نہایت عمدہ ڈرامہ STRANGE INTERLUDE تحریر کیا جو اسے ایک بار پھر قومی تحسین کی حدوں میں لے گیا اور اس پر اسے تیسری بار پلٹزر ایوارڈ ملا۔ ۱۹۲۹ء اس کی زندگی کے لئے ایک مختلف جہت میں سفر کا نیا سال ثابت ہوا۔ سال کے آغاز میں اس کا کھیل DYNAMO پیش ہوا اور اسی سال اس کے گھر کی ناچاقی اجنیس کے ساتھ طلاق تک جا پہنچی۔ ان دنوں اس کی ملاقات یورپ کی ممتاز اداکارہ کارلوٹا مونٹیرے CARLOTA MONTEREY سے ہوئی۔ کارلوٹا کا خیال تھا کہ یوجین اس کی شہرت اور دولت سے متاثر ہے اور اس سے قطعی محبت نہیں کرتا، اس کی خواہش تھی کہ یوجین اس سے محبت کا اظہار کرے، مگر یوجین کا اصرار تھا کہ اسے کارلوٹا کی ضرورت ہے اور وہ

اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کارلوٹا کے پیچھے پورے یورپ میں گھومتا رہا۔ آخر کار فرانس میں کارلوٹا نے ہتھیار ڈال دیئے اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ مگر یہ شادی اس کی زندگی کے لئے ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ اس نے فرانس میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

کارلوٹا نے رفتہ رفتہ اس پر برتری حاصل کر لی اور اسے اپنے دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے بچوں سے بھی علیحدہ کر لیا۔ کارلوٹا دن رات اس کی خدمت کرتی، اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی اور اسے لکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت مہیا کرتی۔ اب انہوں نے کارجیا کے ساحل آئس لینڈ پر ایک بڑے قلعہ نما مکان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں اس کے لکھنے، کھیلنے اور سیر کے اوقات متعین تھے۔ کارلوٹا نے اس کی عادات پر اس طرح قابو پالیا تھا کہ وہ شخص جس نے اسے ڈرامے کی دنیا سے روشناس کرایا تھا، اب اس کے گھر میں محض نوکر کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ یوں لگتا ہے، جیسے کارلوٹا اس کے اس جذبۂ انفعالیت پر قابو پا چکی تھی جو برسوں سے اس پر حاوی تھا۔

۱۹۳۱ء میں اس نے MOURNING BECOMES ELECTRA لکھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے ایک اور شاندار ڈراما DAYS WITHOUT END تخلیق کیا۔ یہ اس کی شہرت اور ملکی و غیر ملکی سطح پر شناخت کے نہایت عروج کے سال تھے۔ اب یوجین اس سمت بڑھ رہا تھا، جہاں شہرت کی آخری منزل اس کی منتظر تھی۔ ۱۹۳۶ء جب کہ وہ YALE یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ایل کی ڈگری (اعزازی) حاصل کر چکا تھا۔ وہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لٹریچر، امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز اور آئرش اکیڈمی آف لیٹرز کا رکن تھا اور بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا، جس نے اس کے مداحین کے لئے مسرت کے دروازے کھول دیئے، وہ نوبیل پرائز تھا جو اس کی مسلسل ادبی خدمات کے عوض اسے

میں اسے دیا گیا تھا۔ سونے کے تمغے کے ساتھ پچاس ہزار ڈالر نقد بھی حاصل ہوئے۔ وہ
ان دنوں امریکہ میں تھا اور امریکہ سے باہر اس کا یہ آخری سفر تھا، جب وہ سویڈش
اکیڈمی کی طرف سے ملنے والے انعام کو وصول کرنے سویڈن گیا۔

نوبیل انعام کے بعد اس کی زندگی میں ذہنی اذیتوں کے ساتھ جسمانی عذاب بھی در آئے
تھے، اس کی مسلسل بیماری اور کارلوٹا کی غیر معمولی توجہ اور سنکی پن نے کارلوٹا کی صحت پہ
بھی اذیت ناک اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں اس کا ایک اور
عظیم ڈرامہ "دی آئس مین کمتھ" THE ICE MAN COMETH سامنے آیا۔ ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنی
زندگی پر وہ شاہکار تخلیق کرنا شروع کیا جو ۱۹۴۳ء میں LONG DAYS JOURNEY INTO NIGHT
کے نام سے مکمل ہوا اور ۱۹۴۶ء میں آئس مین کمتھ پیش ہوا۔

۱۹۴۰ء کے عشرے کے آغاز سے ہی ان کی زندگی میں سکون کا دائرہ تنگ ہونا شروع
ہوگیا، یوجین کے ساتھ ساتھ کارلوٹا کا جسم اور روح بھی مجروح ہونے لگی۔ دوسری طرف
یوجین کی اپنی اولاد کے ساتھ بے رخی اس کے لئے ایک نئے اذیت ناک دور کا آغاز
کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی اُونا کی بغاوت نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ گو
کارلوٹا نے اسے ایک عرصہ دراز سے بیرونی دنیا سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ یہاں
تک کہ اب اس کے نجی خطوط کا جواب بھی وہ خود ہی دیتی تھی، لیکن وہ کسی نہ کسی ذریعے
سے اولاد کی طرف سے آنے والی خبروں سے دل برداشتہ ہونے کا سامان کرتا رہتا
تھا۔ اُونا باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی، بچپن سے اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے
باپ کے ساتھ رہے، مگر کارلوٹا نے ہمیشہ ایسا ہونے سے روک دیا۔ ابھی وہ بڑی ہو رہی
تھی، جب اس نے باپ کو خط لکھا کہ وہ اس کے پاس جارجیا آنا چاہتی ہے، مگر یوجین کی
بجائے کارلوٹا نے اسے آنے سے روک دیا۔ اسی طرح اس نے کچھ سالوں کے بعد خیال

ظاہر کیا کہ وہ فلم کی دنیا میں جانا چاہتی ہے، جس کا جواب بھی کارلوٹا نے ہی دیا، کہ اس کا باپ ایک نامور ادیب ہے اور فلم کا ماحول اچھا نہیں، اس سے اس کے باپ کی بدنامی ہوگی، اُونا جوں جوں بڑی ہو رہی تھی، اس کے اندر باپ کی محبت کے ساتھ ایک نفرت بھی پل رہی تھی، دوسری طرف اس کا بیٹا یوجین اونیل جونیئر نہایت کسمپرسی اور بیماری کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے باپ کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی، جس کے سبب اس وقت جب یوجین کروڑوں کا مالک تھا، بیٹا پائی پائی کو ترس رہا تھا اور اس کا علاج تک نہیں ہو رہا تھا۔ یوجین کو جب اس کی بیماری کی خبر ملتی، وہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا، جس کا جواب اسے جونیئر کی صحت مندی کی خبر سے دیا جاتا کیونکہ کارلوٹا نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے بچوں سے ملے یا ان کی مدد کرے۔

دوسری طرف اُونا انتقام پر اُتر آئی تھی۔ اس نے باپ کی ضد کے طور پر تھیٹر میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ کی بے توجہی اور نظرانداز کرنے نے اس میں ایک نفرت کو ہبھر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا تھیٹر میں آنا باپ کو پسند نہیں ہوگا اور وہ اس طرح باپ کی شہرت اور جذبات کو نقصان پہنچا کر خوشی محسوس کر رہی تھی، اسی دوران اس نے تھیٹر سے فلم میں آنے کا فیصلہ کر لیا، اس اقدام سے اس کے باپ کو سخت تکلیف پہنچی مگر شاید وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی اولاد سے بے رخی کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں یوجین نے اپنا آخری ڈراما A MOON FOR THE MISBEGOTTEN مکمل کیا جو وہ خود اپنے ہاتھ سے ٹائپ کر سکا تھا اور ساتھ ہی ایک بُری خبر اس کی منتظر تھی کہ اُونا نے یورپ کے معروف اور ممتاز مزاحیہ اداکار چارلی چپلن سے ۱۶ر جون ۱۹۴۳ء کو کارپینٹیریا گاؤں میں شادی کر لی، ان دنوں چارلی پہ ایک عدالت میں پہلے سے ایک سکینڈل کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا، جس کے سبب اخبارات اس

کے خلاف خبریں شائع کر رہے تھے، دوسری طرف اُونا کی عمر ۱۸ برس تھی اور چارلی ۵۰ برس گزار چکا تھا، اس کی عمر یوجین سے بھی دو برس زیادہ تھی، یوجین کو اس خبر سے صدمہ تو بہت ہوا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے اور بیٹی کے درمیان برسوں کے منقطع تعلقات کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُونا اس سے بے انداز پیار کرتی ہے، مگر وہ اس کی اس حرکت پر معاف کرنے پر خود کو کبھی آمادہ نہ کر سکا۔

جنگ نے پَر پھیلا دیئے تھے۔ یوجین کے گھر کے ملازمین ملازمتیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ فوج ان سب کو سمیٹ کر لے گئی تھی۔ اب گھر کا سارا بوجھ کارلوٹا پر آن پڑا تھا۔ ادھر یوجین کے ہاتھوں میں رعشہ کے سبب لکھنے اور ٹائپ کرنے سے معذور ہو گیا تھا اب کارلوٹا کو اس کے مسودات بھی ٹائپ کرنے پڑتے تھے، گھر کا سارا کام بھی خود ہی کرتی جس کے سبب وہ ذہنی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی اور ایک دن وہ وقت بھی آن پہنچا جب اس نے ہتھیار پھینک دیئے اور کہا کہ اب اسے اپنے لوگوں میں لوٹ جانا چاہیئے۔ وہ باقاعدہ اپنا علاج بھی کرانے لگی تھی، مالی مشکلات بھی سامنے آئیں، مگر ان ہی دنوں اس کا ڈرامہ " دی ہیری ایپ" ہالی وڈ نے فلمانے کے لئے ۳۰ ہزار ڈالر میں خرید لیا اور ان کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ اب انہوں نے گھر چھوڑ کر ہوٹل میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا گھر ایک لاکھ ڈالر میں فروخت کر دیا۔ گھر سے ہوٹل میں منتقل ہونا اس کے لئے ایک اور بڑا صدمہ تھا، اس نے بڑے کرب سے کہا کہ وہ ہوٹل میں پیدا ہوا اور ہوٹل میں ہی مر جائے گا۔ ان دنوں اس پر موت سوار تھی۔ اس نے کہا کہ جب اسے دفن کیا جائے تو اس کی قبر پر یہ کتبہ لگایا جائے:

EUGENE O'NEIL

THERE IS SOMETHING IS SAID FOR BEING DEAD

۱۹۴۴ء میں وہ دوبارہ آئس لینڈ آ گئے۔ اب بھی کارلوٹا یوجین کو اپنے دوستوں سے ملنے سے روکنے کے لئے ان کے خطوں کے جواب اس طرح دیتی کہ لوگ آنے سے گریز کرتے اور اکتوبر ۱۹۴۵ء میں وہ دوبارہ نیویارک آ گئے جہاں پہنچنے کے بعد پہلی بار اس کے دوستوں کو معلوم ہوا کہ یوجین کی صحت کی خبریں غلط تھیں اور وہ تو زندگی کے آخری دنوں میں سے گزر رہا تھا۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں اس کا ڈراما THE ICE MAN COMETH کھیلا گیا اس کے بعد وہ براڈوے تھیٹر میں حصّہ لینے لگا، مگر زیادہ دیر تک اپنی کمزوری کے سبب اس عمل کو جاری نہ رکھ سکا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کے بیٹے یوجین اونیل جونیئر نے عسرت سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔

۱۹۵۲ء میں اس پر بیماری کا ایک اور حملہ ہوا اور وہ بستر سے جا لگا۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے اپنی زندگی پر طویل تخلیق " دی لانگ ڈیز جرنی ان ٹو نائیٹ " مکمل کر لی۔

یوجین کا نظریہ فن اجنبیت کی فضا میں اُبھرتا ہوا، اس کی زندگی اور تخلیقی کوششوں پر حاوی نظر آتا ہے۔ اجنبیت کا یہ فکری منطقہ اسے خدا سے، ماں باپ سے، گھر سے، بیوی سے، دوستوں سے، فطرت سے اور بالآخر اپنی ذات سے اجنبیت کی ردا میں پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ بے اثر دعاؤں سے آغاز پاتی بے چارگی اور نفرت کی سوچ جس طرح اس کی زندگی کو لپیٹے ہوئی تھی۔ اس نے اس کے فن میں بھی جگہ پالی تھی اور وہ ساری زندگی ڈراموں میں خود کو اور اپنے ساتھ گزرے حالات کو دہراتا رہا۔

اجنبیت، جو ایک مسلسل لیلے کا تقاضا نہ ہے، اس کے ڈراموں کے تار و پود میں سرایت کر گئی۔ ناپسندیدہ بچہ UNWANTED CHILD ہونے سے بیٹے کی المناک موت تک ساری زندگی اس کے لئے ایک المیہ تھی۔ تاہم زندگی کے ان ہی ہولناک تجربات اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیت نے اسے ایک بڑا ادیب بننے میں مدد دی۔ سمندر جو اپنی

گہرائی اور وسعت کے ساتھ سب سے پہلے اس کے تجربے میں آیا، چنانچہ اس کی تخلیقی وژن کا پھیلاؤ افقی، عمودی اور عمیقی ابعاد و جہات کا حامل تھا کہ اس کے تجربے کی دنیا میں چاروں کھونٹ وہ خود پھیلا ہوا تھا۔ جب اس کی آخری تصنیف "لانگ جرنی انٹو نائیٹ" شائع ہو کر آئی تو اس کے نقادوں نے ہی نہیں، اس کے مداحوں نے بھی اسے ایک خود نوشت قرار دیتے ہوئے اس کے کردار اور کہانی کو محض FACE VALUE سمجھا۔ اسے جس ترتیب سے پیش کیا گیا، وہ خود اونیل کی زندگی کی حقیقی تصویر بن گئی تھی، مگر یوجین اونیل نے اس میں سے کئی حقائق نظر انداز کر دیئے تھے، جیسے اس کی پہلی شادی کا اس میں ذکر نہیں تھا، مگر جس فنکارانہ ہنرکاری کے ساتھ اس نے یہ ڈراما پیش کیا ہے، اس نے اس ڈرامے کو محض اس کی آپ بیتی نہیں رہنے دیا بلکہ اسے پورے امریکی معاشرے کی کہانی بنا دیا۔

یوجین کے نظریۂ فن کو سمجھنے کے لئے وہ استدلال بڑی مدد کرتا ہے، جہاں یوجین زندگی کی جبلت کو خواہشات کے راستے میں متصادم پیش کر کے خواہشات کی مجبوری کو پورٹریٹ کرتا ہے، " زندگی جس طرح ہمارے ساتھ سلوک کرتی ہے، ہم اسے روکنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ادراک سے قبل ہی واقعات رونما ہو چکے ہوتے ہیں اور جب ایک بار زندگی خواہشات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے، تو ہر قدم زندگی کی جبلی وحشیانہ انداز اور خواہشات کے درمیان فاصلے بڑھاتا رہتا ہے اور جو ہمیں کرنا چاہیئے اور جو ہو رہا ہوتا، ان دونوں کے درمیان فاصلہ پاٹنا آسان نہیں رہتا، اس سے انسان کی ذات (خواہشات) ہمیشہ کے لئے اس سے کھو جاتی ہے اور یوجین کا نظریہ اجنبیت محرومی اور مایوسی کے اس فکر سے جنم لیتا ہے۔ کیونکہ یوجین کی طرح کوئی بھی اپنے ماضی سے فرار حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی زندگی کے

انتخاب سے انحراف کر سکتا ہے اور نہ ہی ان المیوں کو روکا جا سکتا ہے، جو اپنی مرضی سے زندگی کرنے کی خواہش اور حقیقی طور پر گزرتی زندگی کی دوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ یوجین ٹھیک کہتا ہے کہ جو آپ کرنا چاہتے ہیں، نہیں کر پاتے اور جو ہو رہا ہوتا ہے اس میں شمولیت UNWILLINGNESS آدمی کو مسلسل مجروح کرتی، شکست و ریخت میں مبتلا کر کے اسے کرچی کرچی کرتی رہتی ہے۔

یوجین اونیل کے نظریہ فن کا ایک سرچشمہ آئرش مہاجریت اور نستلجیا بھی ہے، وہ اپنی شناخت اسی منطقے میں قائم کرتا ہے اور اپنے بیشتر ڈراموں میں بار بار آئرش ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ "لانگ جرنی" کا جیمس ٹائرن اصلاً اس کا اپنا باپ جیمس اونیل ہے، جس کا باپ آئرلینڈ سے ہجرت کر کے یہاں آیا ہے۔ یہ نستلجیا واپس لوٹ جانے کا نہیں۔ یہ امریکی آئرش جو گزشتہ صدی کے اواخر یا موجودہ صدی کے اوائل میں امریکہ آئے اور امریکی دنیا میں "اجنبی" ہیں۔ آئرلینڈ پر برطانوی قبضہ کے سبب خود آئرلینڈ میں بھی اجنبی ہی تھے۔ جان ریلے اپنے مضمون (اونیل "لانگ جرنی ان ٹو نائٹ" اور نیا برطانوی کیتھلک ازم مطبوعہ پارٹیزن ۱۹۵۹ء) میں اسے یہودیوں کے "پیچیدہ مسائل" کی طرح پیچیدہ قرار دیتا ہے۔ بالکل یہودی ادیبوں کی طرح یہ دونوں باپ بیٹے بھی تاریخی دیومالا اور آئرش ثقافتی سرمائے سے کسب فیض کرتے نظر آتے ہیں، اور وہ ایک مہاجر باپ کے بیٹے کی حیثیت سے جس سرمایہ سے کسب فیض کرتا ہے اسے تھیٹر کے لئے سرمایہ افتخار بنا دیتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ تھیٹری سرمایہ سے زیادہ اس پر باپ کے اثرات زیادہ نمایاں اور نتیجہ خیز ہیں خواہ یہ اثرات مثبت ہیں یا منفی۔ یوجین نیویارک کے ایک ہوٹل میں پیدا ہوا، ایک مستقل اور مستحکم گھر کا تصور اس کے ابتدائی زندگی میں کبھی اجاگر نہ ہو سکا۔ سات سال کی عمر میں

وہ کیتھلک بورڈنگ کے سکول میں داخل کرایا گیا، اس کے بعد اس نے شاذونادر ہی اپنے بچپن کا وقت اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارا۔ یہیں سے اس کے احساسات میں تنہائی کا تصور ابھرا۔ خاص طور پر کرسمس کی چھٹیوں میں جب اسے سکول میں رہنا پڑتا، کیونکہ اس کے ماں باپ اس سے بہت دور ہوتے، چنانچہ تیسری بیوی کے ساتھ رہتے ہوئے بچوں سے اس کی بے توجہی اور بے رحمانہ سلوک کے پیچھے یہی مناظر پس منظری مواد کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ابتدائی زندگی میں گہرے ناخوشگوار اس کی زندگی میں بے گھری اور اجنبیت کے تصور اس کی پوری زندگی پر نفسیاتی اور عملی دونوں سطحوں پر دکھائی دیتے ہیں، شدید بے گھری کے نفسیاتی اور طبعی اثرات جن کی جڑیں ایک طرف آئرش مہاجرت اور دوسری طرف اس کے بچپن سے جڑی ہوتی ہیں، روحانی مجروحیت کو جنم دیتی ہیں۔ خاص طور پر سکول کے دنوں میں سیاہ قبا اور سفید کلف لگے کالر والی راہبہ عورتیں NUNS اس کے ذہن پر چپک کر رہ گئی تھیں اور یہی احساس بالآخر اس کو کیتھلک مذہب سے دور لے جانے کا سبب بنا۔ جب وہ بیٹس اکیڈمی BETTS ACADEMY میں پہنچا، تو اسے " روحانی گھر" حاصل ہونے کی بجائے مذہب سے دوری ملی، جس کے سبب وہ تمام زندگی مذہبی اعتقاد سے جنگ لڑتا رہا۔ ۱۵ سال کی عمر میں اسے پہلی بار ماں کی نشہ کی لت کی خبر ہوئی۔ یہاں اس کا ایمان مزید کمزور ہوا۔ جب اس نے ماں کے لئے خدا سے دعا کی، جو مستجاب نہ ہوئی، وہ اپنے ایک ڈرامے " ڈیز ودآؤٹ اینڈ DAYS WITHOUT END میں وہ چرچ کی طرف لوٹتا نظر آتا ہے، مگر بچپن سے ذہن میں پلتے بے گھری کے احساس کو چرچ بھی " گھر" مہیا نہ کر سکا۔

اس کے ڈرامے کا تمام پس منظری ورثہ جو تقریباً اس کی ذاتی زندگی کے المیوں سے مستخرج ہے، وہ پورے امریکی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتا دکھائی دیتا ہے۔

یوجین کے مختلف نقادوں نے اسے ایک "بٹا ہوا آدمی" قرار دیا ہے۔ جس طرح یوجین اپنی عملی زندگی میں پبلک سین اور اپنے پروفیشن میں ایک مرتب، ذمہ دار اور معقول شخص تھا اس کے برعکس اس کی ابتدائی نجی زندگی اس قدر غیر مرتب، غیر ذمہ دارانہ اور غیر معقول تھی۔ اسی طرح اس کی نفسی دروں بینی کے حوالے سے اسے مختلف ذاتوں میں بٹا ہوا آدمی کہا گیا۔ اس کے کردار بھی پیچیدہ اور مختلف "ذاتوں" SELVES میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ اٹکنسن نے اس عظیم ڈرامہ نگار کی موت پر اس کے بارے میں جو مضمون لکھا اس میں اسے دوہری شخصیت کا مالک کہا، ایک ابتدائی ذات اور دوسری باغی اور متشدد۔ جبکہ کراس ول بودن نے یوجین کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے "تہری ذات" کا حامل قرار دیا۔

پہلی — باغی متشدد اور شراب نوش

دوسری — عظیم تخلیقی شخصیت اور

تیسری — انسانی المیوں میں گھرا ہوا ایک انسان

یہ تینوں شخصیت ہندی مستھ کی طرف اشارہ کرتی ہیں،

شو — تباہی اور بربادی کا دیوتا ہے

برہما — تخلیق اور تعمیر کا دیوتا اور

وشنو محافظت کا دیوتا

یوجین کے ذہن میں پر اسرار مشرق کی دیومالا ہمیشہ موجود رہی تھی اور اس کے کرداروں یا ذات کی یہ تکون شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر نظر آتی ہے۔ فریڈرک آئی کارپنٹر کے بقول اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں ان ذاتوں کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کا بچپن تخریب اور بغاوت کا عہد ہے جو ۱۹۱۶ء تک جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک نئی

زندگی اس کے سامنے آتی ہے، جو تخلیقی اور تعمیر کے نئے زاویے عطا کرتی ہے، جبکہ ۳۲ رکے بعد وہ اپنی ذات میں سمٹ آتا ہے۔ یہ تین ادوار اس کے زندگی کے یکسر الگ علائق کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے ہم اس کی مختلف ذاتوں کے حوالے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مختلف طریق ہائے حیات کے پس منظر میں بھی اور اس کی تین شادیوں سے کے علائق میں بھی۔

AGAMEMNON

پہلی بیوی کیتھلین جنکسن ۔ جس سے امریکی نیو انگلینڈ کا باشندہ یوجین اس کے ڈرامے ہیزی ایپ میں نظر آتا ہے، جس کی بیوی امریکہ کی اونچی سوسائٹی کی لڑکی ہے جس سے وہ تعلق خاطر پیدا نہ کرسکا کہ یہ اس سوسائٹی سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ کیتھلین ایسی ہیروئن بھی نہیں تھی، جس نے ہیرو کی دنیا کو رد کیا ہو، مگر تعلق خاطر میں نفسیاتی رکاوٹوں کے سبب وہ فراریت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جسے (پہلی شادی کو) وہ اپنی بدترین غلطی سمجھنے پر مجبور ہے۔

دوسری بیوی اس کے برعکس تھی، خود بھی آرٹسٹ تھی اور اس کا باپ بھی۔ یوجین اور اجینس دونوں ایک جیسا پس منظر رکھتے تھے۔ شادی سے پہلے یوجین کئی بار اس سے تلخ پیش آیا مگر اس نے اسے اس اکھڑ مزاجی سمیت قبول کیا اور جس سے اس کی تخلیق کی دنیا میں آسودگی ارزانی ہوئی، مگر تضاد یہ تھا کہ اجینس ایک عظیم ڈرامہ نگار کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی الگ شناخت بھی چاہتی تھی۔ اس کے بعد اس کی زندگی کا تیسرا سفر (تیسری) بیوی کارلوٹا کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "خوبصورتی اور گھریلو سگھڑپن نے اسے کارلوٹا کے قریب کیا" اس کے بعد اس نے کارلوٹا سے کہا کہ اسے کارلوٹا کی ضرورت ہے یہ ضرورت دونوں کی شادی کے بعد زیادہ تحفظ کے ساتھ شروع ہوئی اور یوجین پورے معاشرے، عزیزوں، دوستوں، بچوں سے الگ ہوتا ہوا

کارلوٹا کے گھر اور اپنی ذات میں سمٹ گیا۔

اس کی زندگی کا بہترین ڈرامہ "موزننگ بی کم الیکٹرا" تھا۔ جس میں اس نے طبعی اور نفسیاتی متشدد کی زختم ہونے والی یونانی دیومالا کا سہارا لیا ہے جس میں جنرل ایزا جب خانہ جنگی سے لوٹ کر واپس آتا ہے، تو اس کی بیوی کرسٹائن اپنے آشنا سے مل کر اسے قتل کر دیتی ہے اور اس کی بیٹی الیکٹرا اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے دونوں کو قتل کر دیتی ہے۔ یونانی کی دیومالا اور اساطیر کے سہارے بات کہنے کے کمالِ فن کا اظہار بھی ہے اور اس کی زندگی کی علامتی تفسیر بھی۔

۱۹۵۲ء کے بعد ان کی زندگی ایک مکمل COLLAPSE صورتِ حال میں بسر ہوتی ہے۔ گھر سے فرار انہیں ہوٹل میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کا گہرا جذباتی پن اس کے گہرے المیے کی دلالت کرتا نظر آتا ہے جو اس کی آخری عظیم تخلیقی کاوش "اے لانگ جرنی انٹو نائیٹ" میں دکھائی دیتا ہے جس کا کرب اور المیاتی وظیفہ ایک فرد کی زندگی سے اوپر اٹھا کر امریکی معاشرت اور پھر لامکانی اور لازمانی کیفیتوں کا اظہار کرتا ہوا، اسے آفاقیت عطا کرتا ہے۔

امریکی تھیٹر کا یہ محسنِ اعظم بجا طور پر دنیا کے ڈرامے کا ایک نابغۂ روزگار تخلیق کار ہے۔ وہ ایک جدّت پسند اور جدیدیت کا حامل ایسا ڈرامہ نگار ہے، جس نے تجرباتی تھیٹر کی دنیا میں جدید تکنیک، نیا پیشکش کا انداز، موضوعات کا جہان تازہ اور ہیئت و اسلوب کی تازہ شگفتہ اور شائستہ انداز اختراع کیا۔

اس کی زندگی کا آخری سفر بھی اس کی زندگی کی طرح اداس، تنہا اور اجنبی تھا، ۲۷ر نومبر ۱۹۵۲ء کی شام چار بجے وہ بوسٹن کے ایک ہوٹل میں ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ کارلوٹا نے اسے جس طرح زندگی میں سب کی نظروں سے بچا کر رکھا تھا، اس کی میت کو

بھی سب کی نظروں سے چھپا کر منوں مٹی میں دفن کرنے کے انتظامات شروع کر دیئے۔
۲ر دسمبر کی اداس اور مایوس صبح کو چھ سات افراد پر مشتمل قافلہ "فارسٹ ہل" قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ میت کو قبر میں اُتارنے سے قبل نہ کوئی ماتمی ساز بجا تھا، جس کی خواہش ہمیشہ اس کے دل میں تھی اور جس کا اظہار بارہا اس نے کیا تھا، نہ دعا ہوئی نہ ہی کوئی مذہبی رسم ادا کی گئی۔ کارلوٹا لاش پر جھکی، ماتھے پر بوسہ دیا اور اسے قبر میں اتار دیا گیا اور ایک عظیم آدمی کی آخری رسومات چھ سات منٹ میں مکمل ہو گئیں۔ اس کی قبر پر خوشبو چھڑکی گئی اور اس طرح سوگواروں کا تین افراد پر مشتمل قافلہ واپس چل پڑا۔ (باقی لوگ گاڑیوں میں بیٹھے رہے تھے)
یوجین اونیل ایک اجنبی تھا، سب کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔ اس نے اپنی آپ بیتی "اے لانگ جرنی انٹو نائٹ" میں کہا تھا:
"انسان کی حیثیت سے پیدا ہونا میری ایک بڑی غلطی تھی۔ میں ایک بگلے یا مچھلی کی حیثیت سے پیدا ہو کر زیادہ کامیاب زندگی گزار سکتا تھا۔ میں ایک ایسا اجنبی تھا جسے کبھی گھر میں محسوس نہیں کیا گیا۔ (میں ایک ایسا شخص تھا) جسے کسی کی ضرورت نہیں تھی اور نہ کسی کو میری ضرورت تھی اور جو کبھی کسی سے متعلق نہ تھا۔ جس نے ہمیشہ موت سے محبت کی۔"

Eugene O'Niel

Bibliography

Plays

Ten "Lost" Plays of Eugene O'Neill. New York. Random House, 1964. This volume combines the early Thirst and Other One-Act Plays. 1915: with The Lost Plays of Eugene O'Neill. 1950. It includes: Thirst. The Web. Warnings. Fog. and Recklessness: and also Abortion. The Morte Man. The Sniper. A wife for a Life. and Servitude. A collection of apprentice pieces.

"Children of the Sea." and Three Other Unpublished Plays by Eugene O'Neill. Edited by Jennifer McCabe Atkinson, Washington. D.C. NCR Microcard Editions. 1972. Includes Bread and Butte. Now I ask you. and Shell Shock. More apprentice pieces.

The Plays of Eugene O'Neill. New York. Random House. 1951. The standard edition of all O'Neill important plays published before 1951. Volume I includes: Strange Interlude. Desire Under the Elms. Lazarus Laughed The Foundation, The Moon of the Caribbees. Bound East for Cardiff. The Long Voyage Home. in the Zone. He where the Cross is Made. The Rope. The Dreamy Kid. Before Breakfast. Volume II: Mourning (Hell Hole) Bound East for Cardiff (Thirst) (Beyond the Horizon) (MOROSCO) (Pulitizer) (Ruth) (The Emperor Jones) (Anna Christie) Hairy Ape All God's Chillu got Wings Desire Under the Elms (Oona) (The Foundation) Yale Strange Interlude Dynmo (CARLOTA MONTEREY) Mourning Becomes Electra Days without End Yale (The Iceman Cometh) Long Days Journey into Night A Moon for the Misbego then EUGENE O'NEILL. There is something to be said for being Dead The Iceman Cometh (Unwanted Child) (Days without End) (Selves) Agamemnon (Bret Harte) (Eugene Glad stone O'Neill) (James O'Neill) (The Count of Montecristo) (Ellon) (John O'Neill) (Unwanted Child) (Princeton University) (Kathleen Jenkin) Honduros. A Wife for a Life The Web (Provence town) (Nitilists) (Provence town) Younghill "Good Earth" New Republic (USA) 1. July 1931 p. 195. Paul A. Doyle Paul, The

Dial Press, New York, 1979. Yiddish Buchen, Irving H. Isaac Bashevis Singer and the Eternal Past. The Singer of Warsaw The New York Times Review, May 1966, p.1 Pearl Sydenstricker Buck Abslom Caroline Kung Hsuant'ung Ronald Macon John Lossing Buck Monthly Atlantic "In China Too" The Chinese Women Speaks" (Winds of Heaven) (East Wind; West Wind) (The Good Earth) (Pulitzer Prize) (Luise Rainer Paul Muri) Saga (Qoscar Cargill) (Rougon Macuart) Sons Day (The First Wife and Other Stories (Al Men Are Brothers) (Richard J. Walsh) (The House of Earth) (The mother) (William Dean Howell Medal((A House Divided) (Exile) (Fighting Angel) (In Memoriam) (Fighting Angel) Now and Forever (The Proud Heart) (Abridge of Passing) Anders Osterling) (East Wind: A West:Wind) (The Patriot) (Other Gods) (East and West Association) Tender For tomorrow) (Dragon Seed) (The Promise) (John Sedges) (The Townsman) (The Big Wave) (The Good Earth) (Theodore Harris)

ڈاکٹر اعجاز راہی نے اس کتاب میں بک، سالیلو، سنگر، فاکنز، ہیمنگوے، سٹین بک اور اونیل جیسے عہد ساز اور عظیم المرتبت قلم کاروں کے احوال و آثار پر تفصیلی مقالے سپردِ قلم کیے ہیں۔ ساری دنیا ادب کے مختلف اصناف میں انکے قلم کی عظمت و انفرادیت کا اعتراف کرتی ہے۔

اردو میں ایسی حوالے کی کتابیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ یہ کتاب ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں اور خصوصی طور پر نئے تخلیق کاروں میں مقبول ہو گی۔